ماہنامہ
میثاق
لاہور

قواعد و ضوابط

- ★ میثاق ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔
- ★ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ بیس تاریخ تک دفتر کو موصول ہونی چاہئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جا سکے گا۔

شرائط ایجنسی

- ★ ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے
- ★ پرچہ صرف بذریعہ وی پی پی ارسال ہو گا۔
- ★ کمیشن ۲۵ فی صد۔ محصولڈاک بذمہ میثاق۔

زر تعاون

- ★ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
- ★ سالانہ زرمبادلہ دس روپے
- ★ مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک پچیس روپے

نرخنامہ اشتہارات

ٹائیٹل کا آخری صفحہ "7 × "5 : ۱۲۵ روپے
ٹائیٹل کے اندرونی صفحات : "8 × "5 : ۱۰۰ روپے
(ان کے لیے بلاک مہیا کیجئے ورنہ ٹائپ کی طباعت ہوگی)
اندرونی صفحات : فی صفحہ ۵۰ روپے نصف صفحہ ۳۰ روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ
کوثر روڈ ۔ اسلامیہ پورہ (کرشن نگر) لاہور-۱ (فون 69522)

ہندوستان کے خریدار
مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ زرقوم ارسال کر کے ہمیں مطلع فرمائیں۔
۱ ۔ دفتر ماہنامہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ ۔ ۲۔ دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

ملک میں مارشل لا کو نافذ ہوئے سوا مہینہ ہو گیا ہے۔ اور اس عرصے میں وہ گومگو کی سی کیفیت اور بے یقینی سی صورت حال ختم ہو چکی ہے جو کسی اچانک تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ تک فطری طور پر طاری رہتی ہے۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ حالیہ فوجی حکومت کے ذمہ دار حضرات نے قوم کو بار بار یہ اطمینان دلایا ہے بلکہ اب تو ان کے طرزِ عمل سے بھی بہت حد تک ثابت ہو گیا ہے کہ نہ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے دورِ اقتدار کو غیر ضروری طول دینے کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا مقصد محض ایک ایسی صورت حال کو جو بالکل بے قابو ہوتی جا رہی تھی قابو میں لانا اور ملک کی سیاسی زندگی کی گاڑی کو از سرِ نو صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے اور موجودہ فوجی قیادت اس پر پوری قوم کے تشکر و امتنان کی مستحق ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حالیہ مارشل لا گذشتہ مارشل لا سے بہت مختلف ہے جو بڑی آن بان کے ساتھ ملک و ملت کے جملہ عوارض و امراض کی مسیحائی کے دعوے کے ساتھ آیا تھا اور جس نے صرف ایک نیا تنظیمی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل جدید سیاسی فلسفہ اور مختلف عمرانی معاملات حتیٰ کہ دینی و مذہبی مسائل میں بھی ایک نیا اندازِ فکر قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی —— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے معاملات مارشل لا کے فطری دائرہ کار سے باہر ہیں۔ مارشل لا کبھی کسی قوم یا ملک کے امراض و عوارض کا مستقل اور پائدار علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال زیادہ سے زیادہ ان فوری اور سریع الاثر مگر قلیل وقتی اور عارضی افاقہ بخش ادویہ کی سی ہے جو کسی مرض کی بحرانی کیفیت میں فوری خطرے کو ٹالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہم ان صفحات میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دیانت دار اور باضمیر سیاسی کارکنوں، منظم و محکم سیاسی جماعتوں اور مسلسل اور پیہم سیاسی سرگرمی کا فقدان ہماری قومی و ملی زندگی کا ایک عجیب اور خطرناک خلا ہے جسے لازماً پر کیا جانا چاہئے —— اب ظاہر ہے کہ یہ خلا اگر پر ہو سکتا ہے تو سیاسی سرگرمی ہی سے

ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور مارشل لاء ہرگز اس خلاء کو پر نہیں کر سکتا ——— مارشل لاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ملک کی انتظامی مشینری کو پوری رفتار سے حرکت میں لے آئے۔ سستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دے۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں جمع شدہ کام تیزی سے پورا کرا دے۔ دھاندلی اور غنڈہ گردی کا سدباب کر دے۔ شہری زندگی کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کرا دے اور سرکاری واجبات کی وصولی کا فوری بندوبست کر دے۔ اور الحمدللہ کہ یہ سارے کام پورے زور شور کے ساتھ اس وقت جاری ہیں ——— رہا ملک اور قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور ملک و ملت کو ایک جذبۂ تازہ دے کر سرگرم عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ نہ کسی فوجی حکومت سے اس کی توقع کی جاتی ہے اور نہ ہی، خدا کا شکر ہے کہ ان معاملات میں موجودہ فوجی قیادت نے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کسی لمبی چوڑی مہم کا آغاز ہی کیا ہے ——— خدا کرے کہ یہ صورتِ حال برقرار رہے ——— اور صدرِ مملکت آغا محمد یحییٰ خان اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کی بجائے جلد از جلد ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک طرف تو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس شخص کو جو کسی وقت کسی طرح برسرِ اقتدار آ جائے قوت و اقتدار کے نشے میں مست کر کے اس کے ذریعے اپنا الّو سیدھا کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ——— ایسے لوگ سروسز میں بھی کثرت سے ہیں اور پرانے زمینداروں اور نئے صنعت کاروں میں بھی۔ اور حال ہی میں ان کی صفوں میں کچھ سرگرمی کے آثار بھی نظر آئے ہیں ——— خدا کرے کہ موجودہ فوجی قیادت ایسے لوگوں کے منحوس اثرات سے محفوظ رہے اور کم سے کم مدت میں ان نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر جو اس وقت اس کے کاندھوں پر آ گئی ہیں اپنی تمام تر توجہات اور مساعی کو اپنی اصل اور مستقل ذمہ داری یعنی دفاعِ وطنِ عزیز پر مرکوز کر دے۔

مارشل لاء کے نفاذ سے قبل مسلسل پانچ چھ ماہ سے جو ہنگامی صورتِ حال پورے ملک پر طاری چلی آ رہی تھی اس کے یک لخت خاتمے سے جو پُرسکون کیفیت پیدا ہوئی اس میں ملک و ملت کے بہی خواہوں میں سے بہت سے اصحابِ فکر و نظر نے ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن کے نتیجے میں ہمارے یہاں سیاسی عدمِ استحکام اور فکری و نظریاتی انتشار پیدا ہوا ہے اور یوماً فیوماً بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخبارات و رسائل میں بہت سے عمدہ مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اصحابِ فکر و نظر اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم میں فکر و نظر کی وہی یک جہتی اور جذبہ و عمل کی وہی ہم آہنگی دوبارہ پیدا کی جائے جو آج سے تقریباً ربع صدی قبل کچھ عرصے کے لئے ملتِ اسلامیہ پاک و ہند میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اس وقت وہ کیفیت کیوں اور کن اسباب و عوامل

سے پیدا ہوئی تھی اور آج اسے کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مبہم طور پر یہ کہہ دینا کہ اس وقت بھی وہ جذبہ اسلام کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا ——— اور آج بھی اسے اسلام ہی کی بنیاد پر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں تو شاید روا ہو لیکن ملک و ملت کے ٹھوس مسائل سے بحث کرنے والی سنجیدہ علمی تحریروں کے شایانِ شان نہیں ——— اس لئے کہ اس کے معاً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ اسلام ہی کی بنیاد پر تھا تو بعد میں وہ ختم کیوں ہو گیا؟ جبکہ اسلام سے نہ اس قوم کے عوام منحرف ہوئے نہ خواص ——— بلکہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو یہاں کبھی کسی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اسلام کا کلمہ نہ پڑھتا رہا ہو اور اپنے جملہ مسائل و مشکلات کا حل اسلام ہی میں نہ بتاتا رہا ہو۔

ہمارے یہاں "اسلام ہی" ——— "اسلام!" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے اس وقت جس زور شور کے ساتھ لگ رہے ہیں، ویسے تو ہمارے لئے وہ ہر حال میں خوش آئند ہیں اور ہم بہرصورت انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے ربع صدی قبل کسی محکم اور پائیدار اساس کے بغیر محض ہوا میں ان نعروں کی گونج پیدا کر کے مسلسل بائیس سال تک ہم جس طرح ان کی مٹی پلید کرتے آئے ہیں، مجھے خدشہ ہے کہ آج جس انداز سے یہ نعرے لگ رہے ہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں ان کی حرمت کو کچھ اور بھی زیادہ ہی بٹہ لگایا جائے گا اور ان مقدس الفاظ کی رسوائی پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت جو جلوس یہ نعرے لگاتے تھے ان میں شامل خواتین کی اکثریت باپردہ اور برقع پوش ہوتی تھی ——— اور آج وہ نوجوان لڑکیاں ان کی علمبردار ہیں جو پردے اور برقعے کی قید سے بالکل آزاد ہو چکی ہیں اور نیم عریاں ٹیڈی لباس میں ملبوس ہیں ——— ع "قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا!"

ہمارے یہاں اس وقت جن اصحابِ قلم و قرطاس نے "اسلام" کی دہائی دی ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو "سوشلزم" کے ہوّے سے خوفزدہ ہو کر اسلام کی پناہ گاہ کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور جن کے دین و مذہب سے تازہ شغف کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ع

"جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!"

ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے بعض ایسے حضرات کا حال بھی جن کے خلوص اور اخلاص کے ہم بھی معترف ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کے قدیم شیدائی و فدائی ہیں، یہ ہے کہ خود ان کا مسجد سے کوئی رشتہ و تعلق نہیں اور ان کی جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی اور "تماشائے عالم" کا لقب پاتی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

خدا کے لئے حقائق کا مواجہہ کرنا سیکھئے! ——— حقائق سے گریز محض خود فریبی ہے، اس سے نہ یہ ارض و سماء دھوکا کھاتے ہیں، نہ خالقِ ارض و سماوات، اور "وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ!" کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ——— واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے تو پوری امتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی کب کی دستبردار ہو چکی۔ دین و مذہب کے ساتھ اس کا مخلصانہ رشتہ استوار ہوتا تو یہ عالمگیر ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں ہوتی۔ حالانکہ "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ"

"اِن کنتم مؤمنین ۰" میں نہیں اُمّت کے دعوائے ایمان میں ہے سے

میرؔ کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو جی، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

مدّت مدید گزری کہ اسلام کا شجرۂ طیبہ بیخ و بن سے اکھڑ چکا، اور اب از سرِ نو تخم ریزی و آبیاری کا محتاج ہے دین و مذہب کی عمارت محض شکستہ ہی نہیں ہوئی کہ اِدھر اُدھر کی مرمت سے کام چل جائے۔ یہ عظیم تعمیر کبھی کی زمین بوس ہو چکی اور اگرچہ اس کے کھنڈر اب بھی اس کی عظمتِ رفتہ کے شاہد ہیں۔ تاہم اب ضرورت بالکل بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے اور افسوس کہ امتِ مسلمہ تاحال اس حقیقت کے اعتراف تک پر آمادہ نہیں۔ بلکہ مسلسل مغالطے ہی میں مبتلا رہنے پر مصر ہے ——— ! تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہر تدبیر الٹی پڑتی نظر آئے۔ اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سے ربع صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کی باسی کڑھی میں جو اُبال آیا تھا اس کا اصل محرک دینی و مذہبی جذبہ نہ تھا، نہ آج اس کی ملّی و اجتماعی زندگی میں دین و مذہب کو کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے! اُس وقت کا سارا جوش و خروش ایک ایسی قوم کے جذبۂ تحفظ و خود اختیاری کا رہینِ منت تھا جس کی بنیاد تو صدیوں پہلے مذہب ہی کی اساس پر قائم ہوئی تھی، لیکن جس کا دین و مذہب سے تعلق اب محض برائے نام رہ گیا تھا اور جسے کچھ مخصوص حالات میں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کا قومی تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ ایک بڑی قومیت میں جذب ہو کر رہ جائے گی۔ اس خالص قومی تحریک کے آخری ایام میں خالص وقتی اور عارضی طور پر کچھ رنگ آمیزی دینی و مذہبی جذبے کی بھی کی گئی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک فوری ضرورت (EXPEDIENCY) کے تحت تھا۔ نہ کہ کسی مستقل اور محکم اساس پر ——— چنانچہ جب تحریک ایک حد تک کامیاب ہو گئی اور اس قوم کو اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کی ضمانت کے طور پر ایک علیحدہ خطہ مل گیا تو وہ جوش و خروش بھی فوراً ختم ہو گیا ——— اور دوبارہ اس کا سراغ کبھی ملا تو صرف اس وقت جب ایک بار پھر ۱۹۶۵ء میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قوم کا یہ دفاعی حصار ٹوٹ نہ جائے ——— اور ہندو امپریلزم کا سیلاب اس قوم کو بہا کر نہ لے جائے ——— پھر جونہی یہ خطرہ دوبارہ ٹلا وہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا ——— ! اور پھر وہی صورت حال طاری ہو گئی کہ

"اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر"

یہ ہیں وہ حقائق جن کا ادراک اس لئے ضروری ہے کہ ملک و ملت کا ہر بہی خواہ اچھی طرح سمجھ سکے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کیا ہے ——— اور اصلاح احوال کے لئے کس جگہ سے کام کی ابتدا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاج کی کامیابی کا سارا دار و مدار تشخیص کی صحت و درستی پر ہے ——— ہمارا مرض سطحی نہیں، بہت گہرا اور نہایت مزمن

ہے، اس کا علاج بھی سطحی تجاویز سے نہیں بڑی گہری بنیادی تدبیر ہی سے ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت شاید ہی کوئی کر سکے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں محض وجود و بقا بھی اسلام ہی سے وابستہ ہے ——— لیکن خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اسلام اس وقت ہمارے عقیدہ و عمل دونوں سے خارج ہو چکا ہے اور اب اس کی بازیافت محض نعروں، تقریروں، مقالوں اور بیانوں سے ممکن نہیں ———

اس کے لئے مسلسل اور پتّہ مار کر کام کرنے اور پیہم جدّ و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدّ و جہد کا اصل اور اوّلین میدان علم و فکر کا میدان ہے ——— اور علم و فکر کا رشتہ ایمان و یقین کے ساتھ از سرِ نو استوار کرنا وقت کی اہم ترین اور مقدم ترین ضرورت ہے ——— پھر اخلاق و اعمال کی دنیا میں انقلاب لانا لازمی ہے ——— اس لئے کہ تطہیر فکر اور تزکیۂ اخلاق کی کٹھن مہموں کے سر ہونے کے بعد ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم کے رگ و پے میں دینی و اسلامی جذبہ سرایت کر جائے اور "اِنّ صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہِ ربِّ العٰلمین" کی صورت عملاً پیدا ہو۔

ہماری ان گزارشات سے ممکن ہے کہ بعض احباب کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ شاید ہم فوری طور پر اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کے حامی نہیں، یا یہ کہ ہم پر مایوسی کا غلبہ ہے ——— حالانکہ در حقیقت صورت واقعہ نہ یہ ہے نہ وہ ——— ہم تجدید دین اور احیائے اسلام کی ہر کوشش کی دل سے قدر کرتے ہیں، اور خود بھی بحمد اللہ اپنی صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسی مقصد کے لئے کھپا دینے کا عزم مصمم رکھتے ہیں، پھر ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ بہت جلد انسانیت اپنے مسائل کے حل اور اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے اسلام ہی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوگی اور وہ دور زیادہ دور نہیں جب پورے عالم ارضی پر اسلام ہی کا غلبہ ہو گا ——— لیکن اس کے لئے کیا کام ——— اور کس طرح سے کیا جانا چاہئے، اس کے بارے میں ہمارا ایک پختہ نقطۂ نظر ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ یہ کام کس نہج پر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے تو اس وقت، اور ہمارے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی ہے تو تب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ اس معاملے میں غالباً صرف تساہل فکر کی بنا پر محض سطحی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مسئلے کی حقیقی و واقعی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار ہوک اٹھتی ہے اس وقت جب ہمیں خیال آتا ہے کہ برعظیم کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورتِ حال کی صحیح تشخیص کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریقِ کار پر برسرِ عمل ہوئی تھی ——— وہ بھی قیام پاکستان کے وقت، حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و تحریص (TEMPTATION) کے زیر اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہج کار سے دستبردار ہو گئی اور سطحیت فکر و عمل کا شکار ہو کر وہی خالی نعرے لگانے میں مصروف ہو گئی جن کی شدید مذمت

ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی —— اور آج بھی جبکہ تقریباً ربع صدی گذر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے فاعتبروا یا اولی الابصار —— اس تحریک کا خیال بھی بار بار اس لئے آتا ہے کہ خود ہم نے اسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی تڑپ اسی کے طفیل پائی تھی ؎

گذشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!

دین و مذہب سے قطع نظر کہ وہ بے چارے تو ہمارے یہاں اب صرف "بوقت ضرورت" استعمال کے لئے رہ گئے ہیں، اور اسلام و ایمان کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ وہ غریب صرف لیڈروں کی تقریروں کا مطلع و مقطع فراہم کرنے کے کام آتے ہیں، خالص قومی سطح پر بھی غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہم زندہ قوموں کے لازمی اوصاف سے خطرناک حد تک تہی دست ہیں اور اس میدان میں بھی ہماری تہی دامنی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے —— ہماری قومی و ملی زندگی جس طرح پے بہ پے حادثوں سے دوچار ہو رہی ہے اور ملکی سیاست کی گاڑی جس طرح بار بار زور دار جھٹکوں کے ساتھ رک جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمت عظمیٰ کے حصول سے قبل قومی تعمیر کا کام جس حد تک لازماً ہو جانا چاہیئے تھا وہ ہمارے یہاں نہیں ہوا، اور اس عظیم ذمہ داری سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ناگزیر حد تک بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ گویا آزادی ہمیں ایک ایسے عطیے کی حیثیت سے ملی جس کے لئے ہم عملاً تیار نہ تھے۔

یہ صورت حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جس سے بعض وہ طالب علم جو نچلے درجوں میں رعایتی پاس ہوتے چلے آتے ہیں کسی بڑے امتحان کے موقع پر دوچار ہو جاتے ہیں —— کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ان کی وہ بنیادی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی جو اصلاً ابتدا میں رہ گئی تھی!

برصغیر کی ہندو قوم میں قومی تعمیر نو کا کام انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تو اس میں بے پناہ جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو گیا تھا چنانچہ ہر جہت اور ہر سمت میں تعمیر و اصلاح کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہوا۔ بے شمار انجمنیں بنیں، لاتعداد ادارے وجود میں آئے، ہزاروں ٹرسٹ قائم ہوئے۔ چھوٹی بڑی لاکھوں درسگاہیں تعمیر ہوئیں —— اور لکھوکھا قومی کارکن جذبۂ اخلاص کے مظہر، سادگی و کفایت شعاری کے پیکر اور مجسم قربانی و ایثار بن کر میدان عمل میں کود پڑے —— پھر تعمیر جدید کا یہ کام کسی ایک ہی میدان میں نہیں ہوا بلکہ ایک طرف اگر سیاسی میدان میں ہلچل اور ہماہمی تھی تو دوسری طرف خالص معاشرتی اور سوشل اصلاح اور معاشی

فلاح و بہبود کے لئے بھی زور شور سے کام جاری تھا اور ایک طرف مذہبی اصلاح و تجدید کی کوششیں ہو رہی تھیں، اور مذہبی افکار کے تنقیدی جائزے اور ان میں شکست و ریخت اور تالیف جدید سے نئے نئے دھرم ایجاد ہو رہے تھے۔ تو دوسری طرف صحت و تندرستی کے اصولوں کے پرچار اور ورزش و ریاضت کے عملی پروگراموں سے جسم اور جسمانی قوتوں کے نشوونما کا کام بھی پورے انہماک سے ہو رہا تھا —— غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی ہلچل اور نئی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پوری ہندو قوم میں بیداری اور حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فی الجملہ آزادی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہو گئی۔

مسلمان قوم میں صورت اس کے برعکس رہی اس کی اکثریت "عظمت رفتہ" کی یاد ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپ کر ہی دل کو تسلی دیتی رہی۔ قومی و ملی تعمیر جدید کا کام تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا اور تنزل اور جمود کا تسلط اور بدنظمی، انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ دفعۃً محسوس ہوا کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہونے کو ہے اور اس صورت میں ہندوستان کی مسلمان قوم ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ چنانچہ فوری طور پر اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جیسے تیسے ایک قومی تحریک اٹھی جسے ابتداءً صرف کچھ نوابوں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی اور جس کا دائرہ کار ابتداءً صرف کچھ آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر قوم کے وہ مذہبی طبقات اس سے بدظن بھی ہو گئے جو حریت و آزادی کی راہ میں مسلسل قربانیاں دیتے آئے تھے اور جن میں عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اور اس طرح قوم بے شمار مخلص کارکنوں سے محروم ہو گئی —— آزادی سے متصلاً قبل ایک دو سال کے لئے اس قومی تحریک میں بھی کچھ عوامی رنگ پیدا ہوا تھا۔ لیکن ابھی اس کے کارکن بالکل خام حالت ہی میں تھے کہ آزادی کی گھڑی آ پہنچی اور اللہ تعالیٰ نے ایک خصوصی عطیے اور انعام کے طور پر اس قوم کو بھی ایک علیحدہ وطن و مملکت مل گئی۔

پھر آزادی کیا ملی —— گویا دولت و ثروت کا سیلاب آ گیا جو قوم کی دیانت و شرافت اور خلوص و اخلاص کی رہی سہی پونجی کو بھی بہا کر لے گیا۔ اولاً متروکہ دولت پر چھینا جھپٹی ہوئی پھر تجارت و صنعت کے میدانوں میں دولت کے دریا بہنے لگے۔ دیکھا دیکھی سرکاری ملازموں نے بھی ہاتھ رنگنے شروع کئے اور دشت دولت کے "ہر آبلہ پا" سے زبردستی "خراج" وصول کرنا شروع کیا —— غرض پوری قوم کے سر پر دولت کا بھوت سوار ہو گیا —— قومی تعمیر نو کا کام پہلے ہی نہیں ہوا تھا جبکہ اس کے لئے تمامتر اسباب و عوامل بھی موجود تھے، تو اب کیا خاک ہوتا! خلوص، دیانت، ایثار اور قربانی نام کی کوئی شے پہلے کہیں کچھ موجود تھی بھی تو اس دور میں بالکل ختم ہو گئی۔ ذمہ داری، احساس فرض، تندہی اور محنت کالعدم ہو گئے سیاست نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی، اور روپے پیسے یا زیادہ سے زیادہ کنبہ و برادری کے سوا اس میدان میں کوئی سکہ رواں نہ رہا۔ چنانچہ طبقۂ متوسط کے وہ لوگ جو قومی تحریک کے آخری ایام میں ملی و قومی جذبات کے تحت سیاست

کے میدان میں آگئے تھے رفتہ رفتہ مایوس اور بددل ہو کر اسے خیرباد کہہ گئے۔ اور سیاست اور حکومت کا پورا معاملہ صرف بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا شغل بن کر رہ گیا۔ ان میں سے جو بھی کسی وجہ سے مات کھا جاتا تھا ایسے خاموش اور بیکار ہو کر بیٹھ رہتا تھا جیسے سیاست بازی کے علاوہ ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں ——— نتیجۃً سیاسی انتشار پیدا ہوا۔ جوڑ توڑ اور سازشوں کا بازار گرم ہوا۔ حکومتیں آئے دن بدلنے لگیں۔ بین الاقوامی ساکھ اور قومی وملی معیشت کا دیوالہ نکل گیا ——— تو پہلا مارشل لاء لگا ——— جس نے کچھ عرصہ کے لئے ان امراض کی ظاہری علامتوں کو دبا دیا۔ لیکن جونہی خالص فوجی حکومت سے کسی قدر سیاسی و دستوری حکومت کی طرف رجعت ہوئی وہی پہلا سماں پھر بندھ گیا۔ اور علاماتِ مرض پھر ظاہر ہو گئیں ——— بلکہ حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ——— !!

یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم بحیثیت قوم دوچار ہیں ——— کہ قوم کے سوادِ اعظم کے پیش نظر نہ کوئی نظریہ ہے نہ مقصد، نہ قومی وملی ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ شہریت کے فرائض کا ——— پھر نہ کوئی مستحکم قومی تنظیم موجود ہے نہ قابل اعتماد قومی قیادت۔ سیاسی شعور کی کمی کا یہ حال ہے کہ جو چاہے وقتی طور پر نعرے لگائے اور عارضی طور پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لے ——— اور قیادت کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کے بارے میں ذرا یہ معلوم ہو کہ دیانت دار اور مخلص آدمی ہے، قوم بالکل یتیموں کی طرح سرپرستی کے لئے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے چاہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نو وارد ہی ہو اور سیدھا کسی سرکاری محکمے کی ملازمت سے فارغ ہو کر چلا آ رہا ہو ——— وقس علیٰ ھٰذا۔

اس میں شک نہیں کہ حال ہی میں بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جو کچھ واضح نظریات بھی رکھتے ہیں اور کسی قدر منظم تنظیمی سلسلے بھی۔ لیکن چونکہ ابھی ان کا حلقۂ اثر نہایت محدود ہے۔ وہ وسیع تر قومی وملی تقاضوں کا جواب نہیں بن سکتے۔

یہ حالات متقاضی ہیں کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان کو ادا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جائے اور ان بنیادی کمزوریوں، کمیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لئے کوشاں ہو جو عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہیں اور اس طرح دین و مذہب، علم و فکر، تعلیم و تربیت، تطہیر اخلاق و عمل، سماجی و معاشرتی اصلاح، قومی وملی تنظیم غرض ہر میدان میں اصلاح و تعمیر کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت ملک وملت اس وقت موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت ہماری غفلت میں اضافے کا موجب ہو۔ اور پھر قانون خداوندی کا کوئی کوڑا ہم پر اچانک برس پڑے!

——— ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین آمین ———

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ انعام

(۵)

۱۲- الفاظ واسالیب کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

"آزر" حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے۔ تورات کے عربی اور انگریزی ترجموں اور تالمود سب میں اس کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ اس نام کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے ان روایات کا جو اختلاف ہے وہ اس کو رفع کرنا چاہتا ہے۔ اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے کسوٹی (مہیمن) کی حیثیت رکھتا ہے اور براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے اس لیے ماننا چاہیئے کہ یہی نام صحیح ہے۔

یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت فروش بھی تھے بلکہ عجب نہیں کہ بت خانے کے پروہت بھی رہے ہوں۔ ایسے حالات میں آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کا پیدا ہونا اور باپ کے سارے کاروبار بت پرستی و بت فروشی پر بیٹے ہی کے ہاتھوں یہ ضرب کاری لگنا قدرت الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ حضرات انبیا کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انہوں نے جس حق کی دعوت دنیا کو دی ہے اس کی اذان سب سے پہلے ان کے کانوں میں دی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قریب بھی تھے اور ان کو سب سے زیادہ عزیز بھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو جو دعوت دی ہے اس کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی ہے۔ مثلاً

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ   یاد کرو جب اس نے اپنے باپ سے کہا کہ

مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ
عَنْكَ شَيْئًا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ
صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ
اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝
يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ
مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ
لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝

۴۲-۴۶ سورۂ مریم

میرے باپ، آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے میرے باپ، میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تو میری پیروی کیجئے، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ شیطان کی بندگی نہ کیجئے۔ شیطان خدائے رحمان کا بڑا نافرمان ہے۔ اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آ پکڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔ اس نے جواب دیا، ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے منحرف ہو رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ اب تم میرے پاس سے کچھ دم دفع ہو جاؤ۔

'اتتخذ اصناما اٰلهة' یعنی اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بُت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں آپ بھی مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی۔ دوسری جگہ فرمایا ہے اتعبدون ما تنحتون ۹۵۔ صافات (کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو جن کو خود اپنے ہی ہاتھوں گھڑتے ہو؟)

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝

'وکذلک نری ابراهیم' کے دوسرے مقام میں ہم اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دراصل 'کنا نری ابراہیم' ہے۔ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق یہاں 'کنا' محذوف ہو گیا ہے۔

'ملکوت'، جس طرح 'رہبة' سے 'رہبوت' ہے اسی طرح 'ملک' سے 'ملکوت' ہے۔ 'ملکوت' کا معنوی مفہوم تو عزت، اقتدار، بادشاہی اور سلطنت ہے لیکن قرآن میں یہ لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کے لئے استعمال ہوا ہے جو آسمان و زمین بلکہ ہر چیز پر قائم و دائم ہے۔ اس ملکوتِ الٰہی پر غور کرنے کی دعوت

مختلف اسلوبوں سے، قرآن میں بار بار دی گئی ہے۔ اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض ۱۸۵۔ اعراف (کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا؟) سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیه ترجعون۔ ۸۲ یٰس (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

یہاں یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے وہ اسرار و حقائق کھولے جو انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم پر واضح کیے۔ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ اسی ملکوت پر غور کرنے سے وہ کلید ہاتھ آتی ہے

جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا سرا بھی ہاتھ آتا ہے اور اسی سے اس کے منتہا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی خالق ہے یا یہ خود ہی آ دھمکی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو وہ یکہ و تنہا ہے یا اس کے اور بھی شریک و سہیم ہیں؟ یہ پیدا ہو کر کبھی ختم ہو گی یا اسی طرح ہمیشہ ہمیش چلتی رہے گی؟ اگر اس کا کوئی خالق و مالک ہے تو اس کی صفات و خصوصیات کیا ہیں اور کس لئے اس نے اتنا بڑا عالم کھڑا کر دیا ہے؟ اس دنیا میں حق و باطل کے لئے کوئی معیار ہے یا یہ کوئی اندھیر نگری ہے؟ انسان اپنے اقوال و افعال کے لیے مسئول اور جواب دہ ہے یا بالکل مطلق العنان اور شتر بے مہار ہے؟ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی قادر و قیوم کی تدبیر و حکمت کارفرما ہے یا ان کے اندر الگ الگ مشیتیں اور الگ الگ ارادے زور آزمائی کر رہے ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کے صحیح حل پر ہی صحیح فکر اور صحیح عمل کی بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے آسمان و زمین کے اس نظام پر غور کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور صحیح نتائج تک پہنچنے میں ہمارے فکر کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے اس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کی نگاہ کو اس نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اس پھول کے حسن و جمال، اس کی رعنائی و دلکشی، اس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اس کے صانع کی قدرت، کاری گری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلووں سے بیخود ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے۔

بے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری :

حالانکہ ایک صاحب نظر کے لیے پھول کا یہ پہلو زیادہ جاذب نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل فروشی ہوتا تو صرف اسی مقصد کے لیے اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی! یہ گل کاری اور صنعت گری تو اسی لئے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفت کردگار کے دفتر کا کام دے۔

نیوٹن نے سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گرتے دیکھا اس سے اس کا ذہن زمین کی کشش کے اصول کی طرف منتقل ہوگیا۔ پھر اس اصول سے بہت سے اصول دریافت ہوگئے جو علمی تحقیقات و انکشافات میں بہت نافع ثابت ہوئے لیکن نگاہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس اصول کی تمام کارفرمائیاں بس اسی دنیا کی تنگ نائے کے اندر محدود رہ گئیں۔ ورنہ یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، جذب و کشش کے اس قانون سے باندھ رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایماندارانہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ذالك تقدير العزيز العليم یہ سارا کارخانہ ایک غالب و مقتدر اور ایک حکیم و علیم کا بنا ہوا ہے۔ لیکن اس سوال اور اس کے جواب سے چونکہ بہت سی ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمارے سائنس دان اس سے بھاگتے ہیں۔

زیربحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمان و زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے" تو اس سے اسی بلند نگاہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی ہدایت سے حضرات انبیائے کرام کو بالخصوص حاصل ہوتی ہے اور بقدر استعداد اس توفیق میں سے وہ لوگ بھی حصہ پاتے ہیں جو ایماندارانہ اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کے نتائج سے گریز کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلاً میں اسی گروہ کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

'ولیکون من الموقنین'۔ یہاں عربی زبان کے اس معروف قاعدے کے مطابق جس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، معطوف علیہ محذوف ہے جس کا تعین قرینہ کرے گا۔ یہاں آگے وضاحت موجود ہے کہ اس مشاہدۂ ملکوت سے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی وحدانیت کی اس دلیل کی طرف رہنمائی فرمائی جو انہوں نے اپنی قوم پر قائم فرمائی چنانچہ فرمایا ہے وتلك حجتنا آتيناها ابراهيم على قومه (اور یہ ہے ہماری وہ دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی

قوم کے مقابل میں عطا فرمائی) اس قرینہ کی روشنی میں اگر اس محذوف کو کھولا جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور تاکہ وہ اہل یقین میں سے بنے۔"

یقین کے مدارج

یہاں جس 'یقین' کا ذکر ہے یہ وہ یقین ہے جو ایمان کے اوپر کا درجہ ہے جس کو حق الیقین سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے لیکن یقین، فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ چنانچہ آگے نرفع درجات من نشاء میں اسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے تب اس کا فیضان متعدی ہوتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔ حضرات انبیاء چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ اس میں سے حصۂ وافر پاتے ہیں اور پھر ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہوتا ہے جو ان کے متبعین باحسان میں شامل رہتے ہیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۷۶-۷۹

ان آیات میں لغت یا اسلوب زبان کا کوئی اشکال نہیں ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ اوپر والی آیات کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے حوالہ دیا کہ کس طرح ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے دین کے کھوکھلے پن کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور ان کی کھلی ہوئی گمراہی پر ان کو ملامت کی۔ پھر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح ہم ابراہیمؑ پر آسمان و زمین میں اپنی ملکوت کے اسرار و حقائق بے نقاب کرتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر ہماری حجت قائم کرے اور تاکہ وہ کاملین یقین میں سے بنے۔ اس کے بعد اب یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی قوم پر یہ واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہی ہے وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ وہ ملکوت الٰہی کے تابع اور اس کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں

مجال نہیں ہے کہ سر مو ادھر اُدھر ان سے تجاوز کر سکیں۔ اس وجہ سے عبادت کا اصلی مستحق وہ ہے جو ان سب کا خالق و فاطر ہے نہ کہ یہ جو محکوم و مقہور ہیں۔ اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کی وضاحت کریں گے لیکن اس وضاحت سے پہلے چند باتیں حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ خطاب و استدلال سے متعلق سمجھ لینی ضروری ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام یوں اپنی دعوت اور اپنے مقصد کے اعتبار سے تو بالکل یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے ہیں لیکن اپنے مخاطبوں کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور ان کے ذوق کے اختلاف کے سبب سے ہر نبی کے طرزِ خطاب اور طریقۂ استدلال و بحث میں کچھ امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام زیادہ تر تمثیلوں میں بات کرتے تھے۔ بعض انبیاء میں موعظت کا رنگ غالب ہے۔ بعض کے ہاں قانون کا انداز نمایاں ہے۔ یہ فرق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، زیادہ تر نتیجہ ہے مخاطبوں کے ذوق و مزاج کے فرق و اختلاف کا، لیکن کچھ اس میں اس ذوقی رجحان کو بھی دخل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر طبیعت میں الگ الگ ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، جیسا کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مناظرہ باز اور حجت طراز قوم تھی۔ اول تو لوگ بات سننے کے لیے آسانی سے تیار ہی نہ ہوتے اور اگر کبھی سنانے کا کوئی موقع نکلتا بھی تو بڑی جلدی بدک جاتے اور مباحثہ و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے۔ ان کے مزاج کی اس وحشت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈھتے جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آ سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ میں موجود ہے جو سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے۔ انہوں نے ایک دن موقع نکال کر قوم کے بت خانے کے سارے بت ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیئے، صرف بڑے بت کو سلامت چھوڑ دیا۔ جب پوچھ گچھ شروع ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ سے سوال ہوا کہ کیا یہ تمہارا فعل ہے، انہوں نے جھٹ جواب دیا کہ یہ تو اس بڑے بت کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے۔ اگر یہ بولتے ہیں تو اپنی مصیبت کی داستان خود ہی سنا دیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات سن کر پہلے تو سب پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا کہ فی الواقع ہم کتنے احمق ہیں کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں جو خود اپنی حفاظت سے بھی قاصر ہیں۔ جب یہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو بھلا ہماری حفاظت کیا کریں گی۔ اس طرح اندر سے ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔ لیکن پھر حمیت جاہلیت کے جوش میں

حضرت ابراہیمؑ کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی تو اس کوشش میں اپنی حماقت کا اعتراف بھی کر گئے۔ بولے کہ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ان کے اس اعتراف پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک نہایت عمدہ موقع ان کی حماقت پر توجہ دلانے کا مل گیا اور انہوں نے ایک نہایت موثر تقریر کی کہ تم پر افسوس ہے کہ تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ کسی نفع پر قادر ہیں نہ کسی نقصان پر۔

اس طریقۂ استدراج کے تقاضے سے حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی توریہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ توریہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی کوئی اسکیم پوری کرنے کے لئے حریف کے سامنے اپنی بات اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بات تو بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن اس کے پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ حریف اس سے مغالطے میں پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہوشیاری کے باوجود وہ اسکیم کے بروئے کار آ جانے سے پہلے اس سے آگاہ نہیں ہو پاتا۔ اس کی نہایت لطیف مثال سورۂ صافات میں ہے۔ انشاء اللہ ہم اس پر اس کے مقام میں گفتگو کریں گے اور وہیں بعض الفاظ کی وضاحت بھی کریں گے جن کے صحیح مفہوم سے بے خبری کے باعث بہت سے لوگ نہایت افسوسناک قسم کی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

اس استدراج اور اس توریہ میں کہیں کہیں پاکیزہ ظرافت بھی شامل ہو جاتی ہے جو کچھ تو اس استدراج اور توریہ کا فطری تقاضا ہوتی ہے اس لئے کہ ہر کام ایک مخصوص انداز اور مخصوص اسلوب کا طالب ہوتا ہے اور کچھ اس میں اس لطافت ذوق کی نمود بھی ہوتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے مزاج کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثالیں سورۂ انبیاء اور سورۂ صافات میں آئیں گی۔

اس تمہید کے بعد اب زیر بحث آیات پر غور فرمایئے۔

ایک دن انہوں نے ایک ستارے کو چمکتے دیکھا (ہو سکتا ہے کہ یہ ستارہ زہرہ ہو جس کو ان کی قوم پوجتی بھی رہی ہو اور ستارہ بھی) تو بولے کہ ہاں بھائی "یہ میرا رب ہے"۔ قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ بات انہوں نے خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح فرمائی ہوگی کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے۔ سننے والوں نے جب ان کی زبان سے یہ بات سنی ہوگی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک ایسا شخص جو باپ دادا کے دین اور ہمارے معبودوں سے بالکل بیزار ہے جس حد تک بھی ہمارے ساتھ موافقت کر رہا ہے اسی پر قناعت کرو اور زیادہ اس کے درپے نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب ستارہ ڈوب گیا تو انہوں نے بالکل اسی انداز میں اپنے کو مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ "میں ان ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ سننے والوں کا سابق اطمینان تو ان کی یہ بات سن کر رخصت ہو گیا ہوگا لیکن وہ اس سوچ میں پڑ گئے

گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کا ہمارے معبودوں سے انحراف محض نوجوانی کی ترنگ اور بے قیدی و آزادی کی لاابالیانہ خواہش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ نے اس کے عقیدے کو متزلزل کر دیا۔ چونکہ بات ان کو براہِ راست مخاطب کرکے تحدی کے انداز میں نہیں کہی گئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ مشتعل بھی نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ وہ اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری بات ہی میں کوئی کمزوری ہے۔

کسی جمود کا اس حد تک ہل جانا بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح ان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ ان ستاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوب جانا کیوں نہیں دیکھتے؟ جب طلوع کے ساتھ غروب، اور ابھرنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور اس محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت اور شکل میں سرِ مو تغیر ہو جائے تو یہ تو گویا وہ خود زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آئے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات بھی ان کے کانوں میں ڈال دی کہ خالق و مالک کے ساتھ بندے کا تعلق محبت کی بنیاد پر ہے، نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر۔ مجرد خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو جائے اور حق بھی اس کی عبادت کا۔ مشرکین کے لیے یہ بات بھی ایک نئی رہنمائی دینے والی بات تھی اس لیے کہ شرک کی بنیاد تمام تر خوف پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے گویا بتایا کہ میں مجرد خوف کی بنا پر کسی کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ محبت کی بنا پر عبادت کرتا ہوں اور محبت کی سزاوار یہ آنی جانی چیزیں نہیں بلکہ صرف وہ ہے جس کے حکم سے یہ چیزیں آتی جاتی ہیں۔

"فلما رأ القمر بازغا الآیۃ"۔ اسی طرح کسی دن، پورے چاند کی کھلی ہوئی چاندنی میں انہوں نے پھر اس تعلیم کے لیے موقع پیدا کر لیا اور بالکل اسی لب و لہجہ اور اسی انداز میں انہوں نے چاند کے متعلق وہی بات کہی جو اوپر ستارے کے متعلق فرمائی تھی۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو انہوں نے اسی طرح اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے اور آس پاس والوں کو سناتے ہوئے فرمایا کہ "لئن لم یہدنی ربی لاکونن من القوم الضالین" (اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا) غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تعلیم کا قدم پہلے کی نسبت سے آگے ہے۔ یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوتی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا

کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوتی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بڑے حسرت و اندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوتی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اسی کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں، اس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی اس کے لئے ان سے چڑھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہوگی وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہوگا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ بات فرمائی کہ "لئن لم یہدنی ربی لاکونن من القوم الضالین"، تو یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ہدایت ہمیشہ خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے، اگر وہ ہدایت نہ دے تو کسی کو بھی ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں نے اس کو شرط فی الماضی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے یہ بات کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے پہلے گمراہی میں تھے یا اپنے کو گمراہی پر سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے اپنی فطرت سلیم کا آئینہ دوسروں کے سامنے رکھا ہے کہ لوگ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں۔ بس آئینہ رکھ دیا ہے، خود ان کو مخاطب کر کے کچھ کہا نہیں ہے کہ وہ وحشت زدہ اور بدگمان نہ ہوں۔

اسی طرح ایک دن انہوں نے سورج کے طلوع و غروب کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنا لیا۔ سورج جب آب و تاب سے نکلا اور نصف النہار پر پہنچا تو اسی انداز میں جس کا ذکر اوپر گزرا، انہوں نے سورج کے متعلق بھی وہی بات فرمائی جو تارے اور چاند کے متعلق فرمائی تھی البتہ اس کے ساتھ اتنا اضافہ بھی فرما دیا کہ "ھذا اکبر" (یہ سب سے بڑا ہے)۔ قرینہ صاف پتہ دے رہا ہے کہ یہ بات انہوں نے طنز، تحقیر اور استہزا کے طور پر فرمائی لیکن سننے والوں نے پھر اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو، اس سرپھرے آدمی سے یہ بھی غنیمت ہے۔ زہرہ اور چاند کو نہیں مانتا نہ سہی، ہمارے بڑے دیوتا سورج کو تو مانتا ہے۔ لیکن ان کا یہ اطمینان بھی زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔ آخر سورج کو بھی ڈوبنا ہی تھا، وہ بھی ڈوب گیا، جب وہ بھی ڈوب گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے بالکل کھل کر اور سب کو مخاطب کرکے حق کا اعلان فرما دیا کہ "یا قوم انی بریئ مما تشرکون" (اے میری قوم کے لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں)۔ اب تک انہوں نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی نوعیت خود اپنے اوپر اپنے تاثرات کے اظہار کی تھی، اگرچہ اس سے مقصود بالواسطہ قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا ہی تھا

لیکن قوم کو براہِ راست مخاطب نہیں فرمایا تھا۔ اب انہوں نے ان کو براہِ راست مخاطب کرکے ان کے دین اور ان کے معبودوں سے اپنی برأت کا اعلان فرما دیا۔

[illegible]

'انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین' یہ اس اعلانِ برأت کی تعبیر اور اس کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ 'للذی' کا 'ل' اس بات پر دلیل ہے کہ 'وجهت' کا لفظ 'اسلمت' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو بالکلیہ آسمان و زمین کے خالق و مالک کے حوالہ کر دیا۔ یہ توحید اور اسلام کی عظیم آیت اور ملتِ ابراہیمی کا کلمہ جامعہ ہے اور ہم چونکہ اپنی نمازوں میں اسی حقیقت کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا آغاز اسی کلمۂ جامعہ سے کرتے ہیں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۸۰-۸۲

[illegible]

'وحاجه قومه' جب بات یہاں تک پہنچ گئی، حضرت ابراہیمؑ نے صاف صاف نہ صرف توحید کا بلکہ شرک اور شرکاء سے اپنی برأت کا بھی اعلان کر دیا تو ان کی قوم ان سے بحث، جدال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور شرک کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے اس وجہ سے قوم کے لوگوں نے طرح طرح سے ان کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو ان کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں فرمایا کہ تم خدا کے باب میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں تنہا اسی کو کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا؟ اسی خدا نے تو مجھے یہ ہدایت بخشی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی اور یہ بات صرف حضرت ابراہیمؑ کی قوم ہی کے ساتھ مخصوص

نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی قوم بھی خدا کی منکر نہیں ہوئی ہے۔ جس نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اس کی توحید کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے۔ 'ولا اخاف ما تشرکون به الا ان یشاء ربی شیئا' یہ قوم کے ڈراووں کا جواب ہے کہ میں تمہارے ان فرضی شریکوں سے ذرا نہیں ڈرتا مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک میرا رب مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہے، نفع نقصان اسی کے اختیار میں ہے، اس کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس وجہ سے مجھے یہ اندیشہ بھی نہیں ہے کہ کوئی اس کی لاعلمی میں مجھے کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ یہ تم لوگ کیسی باتیں کرتے ہو، کیا تم لوگ سوچتے نہیں! 'الا ان یشاء اللہ' میں تفویض الی اللہ کا مضمون ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مضمون حضرت شعیبؑ کی زبان سے سورہ اعراف میں بھی آیا ہے قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا یَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۸۹-اعراف) (اگر ہم تمہاری ملت میں پھر لوٹ گئے بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات بخشی تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھیں گے، یہ ہم سے تو ہرگز نہیں کہ ہم پھر اس میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا) اس سے معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور سچے سے سچے عزم کی تکمیل بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہی منحصر ہے اس وجہ سے بندے کو کوئی بات بھی مجرد اپنے اعتماد پر دعوے کے ساتھ نہیں کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے اس لئے کہ ہر راہ میں اس کی آزمائشیں ہیں اور ان آزمائشوں میں پورا اترنا اس کی مدد اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔

[illegible]

'وکیف اخاف ما اشرکتم الایۃ' یعنی ڈرنا تو تمہیں چاہیئے خدا کے غضب اور اس کے قہر سے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے بارے میں تمہارے پاس خدا کی اتاری ہوئی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے لیکن الٹے تم ڈرا مجھے رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو، میں بھی مانتا ہوں۔ یہ تو ایک مسلّم بات ہوئی۔ اب خدا کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو خدا کے شریک و سہیم ہیں تو اس کا بارِ ثبوت تم پر ہے۔ اگر تم بے ثبوت ان کو شریکِ خدا بنائے بیٹھے ہو تو تم ۔ ۔ ۔ خدا کے اقراری مجرم ہو اور اگر وہ تم کو اس کی سزا دے تو تم سزا کے مستحق ہو۔ میں نے کس کا جرم کیا ہے جس سے ڈروں! اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ خدا کی امان کا حقدار میں ہوں یا تم؟ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم چور ہو کر الٹے کوتوال کو ڈانٹتے ہو۔

'الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم' (الآیہ) ، ظلم سے مراد، جیسا کہ ایک سے زیادہ مقامات میں ہم واضح کر آئے ہیں، شرک ہے۔ اب یہ توحید کے باب میں اصل حقیقت کا بیان ہے کہ خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ جس ایمان کے اندر شرک کی ملاوٹ ہو وہ ایمان خدا کے ہاں معتبر نہیں۔ تم امن کا ضامن اپنے شرکا کو سمجھتے ہو اور خدا سے بے نیاز ہو حالانکہ امن کے سزاوار وہ ہیں جو ہر معاملے میں صرف خدا پر اعتماد رکھتے ہیں اور شرک سے بری ہیں۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اس کے سوا ہر راہ گمراہی کی راہ ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۸۳

'تلک حجتنا اتینھا ابراھیم علی قومہ' یہ اشارہ توحید کی اس دلیل کی طرف ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر قائم فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے مذکور ہوئی۔ اس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقاء سمجھتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقا نہیں بلکہ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ان کی دعوت کا ارتقاء کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقاء بیان ہوا ہوتا تو علی قومہ کے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

یہاں چند اور باتیں بھی ذہن میں رکھئے۔

ایک یہ کہ حضرات انبیا علیہم السلام فطرت سلیم پر پیدا ہوتے اور فطرت سلیم ہی پر پروان چڑھتے ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی ان کو کبھی توحید و شرک کے معاملے میں اشتباہ پیش نہیں آتا۔ توحید تو عہد فطرت ہے جو خدا نے اولاد آدمؑ سے ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی لیا ہے اور قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اس عہد کی بنا پر توحید کے معاملے میں ہر شخص عند اللہ مسئول ہو گا خواہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ ایسی حالت میں کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی کسی شرک سے آلودہ ہو سکتا ہے[1]۔ نبوت سے پہلے بھی حضرات انبیاء جہاں تک مبادی فطرت کا تعلق ہے، بالکل فطرۃ اللہ پر ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ نخل فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں۔ اس دور میں انہیں جو جستجو

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث سورہ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے تحت آئے گی۔ اپنی کتاب 'حقیقت شرک' میں بھی ایک فصل 'شرک کا اصل سبب' کے عنوان سے ہم نے اس مسئلہ پر لکھی ہے۔

ہوتی ہے وہ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ جستجو بھی درحقیقت اسی فطرت سلیم ہی کی پیاس ہوتی ہے جو اپنے بلوغ پر بھڑکتی ہے اور سیرابی و آسودگی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یہ سیرابی اس کی وحی کے ابر نیساں سے حاصل ہوتی ہے۔ انبیاء کے لئے وحی کی حیثیت تاریکی کے اندر روشنی کی نہیں بلکہ روشنی کے اوپر روشنی کی ہوتی ہے۔ نور علی نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورہ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا ملکوت الٰہی سے جو استشہاد اوپر مذکور ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے کا نہیں بلکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کا ہے جب انہوں نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا ہے۔ پہلے انہوں نے اپنے باپ کو دعوت دی اور یہی حضرات انبیاء کی معروف سنت رہی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنے سب سے زیادہ قریبی عزیزوں کو دعوت دی ہے۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج اس طرح اعلان حق فرمایا جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے آیات ۷۹-۸۰ میں موجود ہے۔ ان آنکھ کھول دینے والے الفاظ میں یہ زندہ جاوید کلمات ایک نبی کے سوا کون کہہ سکتا ہے!

تیسری یہ کہ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقاء ہوتا تو واقعات کی یہ ترتیب بالکل خلاف فطرت ماننی پڑے گی۔ آخر سب سے پہلے ان کو ایک چھوٹے سے تارے ہی نے کیوں اپنی طرف متوجہ کیا، ہر صبح کو اس کروفر سے طلوع ہونے والا سورج کہاں چلا گیا تھا؟ اس قسم کے خلاف فطرت مشاہدے کے لیے پھر اس سے زیادہ خلاف فطرت یہ روایت لوگوں کو گھڑنی پڑی کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ایک غار میں ہوئی تھی، اسی میں وہ پلے اور جوان ہوئے اور جب اس سے نکلے تو شب کا وقت تھا اور پہلی چیز جس کا انہوں نے اس کائنات کی جاذب نظر چیزوں میں سے مشاہدہ کیا وہ زہرہ ستارہ تھا۔

چوتھی یہ کہ استدراجی طریقہ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس کو اسی داؤں پر شکست دینا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤں سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ملکۂ یقین کے لئے اپنی جس سنت استدراج کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے اس کی بھی خاص خصوصیت یہی بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ وہیں سے ان کو دھر لیتا ہے جہاں سے ان کو اپنی کامیابی و فتح مندی کا غرہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اگر سورج، چاند، زہرہ کی پرستش کرتی تھی تو آخر اس کے نزدیک ان کی خدائی کی دلیل کیا تھی؟ یہی نا کہ وہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی کو پکڑ لیا کہ اگر طلوع ہونا اور چمکنا ہی ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو اور بتاؤ تمہاری وہ دلیل کہاں گئی!

نفسیات انسانی کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی خدائی کی دلیل ان کے وقتی کر و فر ہی سے اخذ کی گئی ہو ان کی بے ثباتی اور ناپائداری پر سب سے موثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے جب ان کی لاش ان کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔

پانچویں یہ کہ انبیاء کے طریق کار اور خطاب و استدلال میں، استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ، جو بظاہر ٹھہراؤ ہوتا ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دل آویز طنز، جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا نے چاہا تو قرآن کے آخری گروپ میں دعوت انبیاء کے یہ نفسیاتی پہلو تفصیل سے زیر بحث آئیں گے۔

'نرفع درجات من نشاء ان ربک حکیم علیم'۔ 'درجات' تمیز بھی ہے اور اس پر تنوین بھی ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ اوپر 'ولیکون من الموقنین' کے تحت ہم نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی کی تعبیر یہ دوسرے الفاظ میں ہے کہ جو لوگ ملکوت الٰہی پر غور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی طرح علم و معرفت اور ایمان و یقین میں ان کے مدارج بلند کرتا جاتا ہے۔ 'حکیم و علیم' کی صفات کا یہاں حوالہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے اپنے اس 'چاہنے' کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی اس کا یہ 'چاہنا' اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے قرب کے مدارج آنکھ بند کر کے نہیں بانٹتا بلکہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے سزاوار ہوتے ہیں اور جو اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس میں نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آدمی اگر عقل و فکر سے کام نہ لے تو اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو معبود بنا کر سجدے کرتا اور ان سے حاجت روائی کا امیدوار ہوتا ہے اور اگر عقل و فکر سے کام لے تو شمس و قمر اور زہرہ و مشتری سب اس کی راہ کی گرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ

وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ○ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۔ ۸۴-۹۱

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی توحید کے ساتھ ساتھ ان کے روحانی و ایمانی مدارج کا بیان ہوا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو اور ان کی دعوت کو رفع ذکر اور شہرت و دوام کی عزت و سرفرازی عطا فرمائی۔ ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء اور بلند مرتبہ صالحین و مجددین اٹھے اور ان سب کا دین وہی دین توحید تھا جس کی دعوت ابراہیمؑ نے اور ان سے پہلے نوحؑ نے دی۔ مطلب یہ ہے کہ یہی دین تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تم بھی اسی دین کی دعوت دے رہے ہو۔ اگر تمہاری قوم اس کو قبول نہیں کرنا چاہتی تو تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ نے دوسروں کو کھڑا کر دیا ہے جو اس کے حامل بنیں گے۔ تمہیں ان کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بہرحال انہی لوگوں کے دین کی پیروی کرنی ہے جن کو اللہ کی ہدایت نصیب ہوئی تو تم انہی کی پیروی کرو اور ان مخالفوں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں تم سے کسی عوض کا طالب تو ہوں نہیں کہ اگر تم نے میری دوکان سے مال نہ خریدا تو میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں تو تمہارے سامنے جو کچھ پیش کر رہا ہوں تمہارے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اس کو قبول کرو تو تمہارا اپنا نفع ہے، نہ قبول کرو گے تو تم خود بھگتو گے، میرا کچھ نہیں جائے گا۔

'ووھبنا لہ اسحاق ویعقوب الآیہ'۔ حضرت اسحاقؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ پوتے ہیں۔ فرمایا کہ 'کلا ھدینا' ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی یعنی اسی دین توحید اور اسی صراط مستقیم کی جس کی دعوت ابراہیمؑ نے دی۔ 'ونوحا ھدینا من قبل' یہ حضرت ابراہیمؑ سے اوپر کے سلسلۂ ہدایت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو بھی ہم نے اسی راستے کی ہدایت کی تھی اور انہوں نے اسی کی دعوت دی۔ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ اس پہلو سے گویا اوپر اور نیچے دونوں کی کڑیاں مل گئیں۔ 'ومن ذریتہ' میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ فرمایا کہ اسی کی ذریت میں سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اسی صراط مستقیم کی ہدایت سے نوازا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سارے حضرات جلیل القدر انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی ان میں مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو بادشاہت یا کسی نہ کسی نوع کی سیاسی سیادت حاصل ہوئی۔ 'وکذٰلک نجزی المحسنین' میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انہیں یہ ہدایت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ یہ خوب کار لوگ تھے، اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں بخشیں ان کو انہوں نے صحیح استعمال کیا تو اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ گویا اس کا کوئی تعلق خاندان کی وراثت سے نہیں بلکہ تمام تر صفات و اخلاق سے تھا۔

'وزکریا ویحیٰی الاٰیۃ' زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام مشہور پیغمبروں میں سے ہیں۔ 'الیاس' سے مراد تورات کے ایلیا نبی ہیں۔ ان پیغمبروں کی نسبت بھی فرمایا کہ اللہ نے ان کو بھی اسی صراط مستقیم کی ہدایت بخشی جس کی ہدایت ابراہیمؑ اور دوسرے نبیوں کو بخشی۔ یہ بھی توحید اور اسلام ہی کے داعی تھے، کسی اور دین کے داعی نہیں تھے۔ 'کل من الصالحین' یہ سب کے سب زمرہ صالحین میں سے تھے۔ اس سے ایک تو وہی بات نکلی جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ یہ جو کچھ انہیں حاصل ہوا ان کے صلاح و تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوا، دوسری بات یہ نکلی کہ یہ تھے بہرحال خدا کے صالح بندوں ہی میں سے، ان میں سے کسی کو خدائی کا مقام حاصل نہیں تھا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق گمان کیا جس طرح مذکورہ بالا انبیا میں حکومت و سیادت مشترک وصف کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح ان انبیا میں زہد، فقر اور تبتل کی شان مشترک ہے۔

'واسمٰعیل والیسع ویونس ولوطا الاٰیۃ' ان ناموں میں سے تین نام اسمٰعیلؑ، یونسؑ، لوطؑ تو مشہور ہیں۔ قرآن میں بھی ان انبیا کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے نام ہیں۔ ایک الیشع جن کا زمانہ ۸۳۱ ق۔م بتایا جاتا ہے، دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ ۷۴۲ ق م بتایا گیا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ 'وکلاً فضلنا علی العالمین' میں اسی منصبی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو ہر نبی کو اس کے منصب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ نبی چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ان انبیا کے لیے جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تمام انبیا کی مشترک صفات ہیں۔ الگ الگ بیان کرنے سے مقصود ان کی تخصیص نہیں، محض تعدید ہے تاکہ ہر صفت پر قاری کی الگ الگ توجہ ہو جائے۔

'ومن اٰبائہم وذریاتہم الاٰیۃ' یعنی یہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔

فرمایا کہ ہم نے انہیں بھی اپنی راہ دکھائی، انہیں برگزیدہ کیا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ 'اجتبیۃ' سے مراد یہاں وہ برگزیدگی ہے جو اللہ نے اپنی توحید اور ہدایت کی دعوت و اشاعت کے لیے ان کو بخشی 'صراط مستقیم' سے مراد یہاں توحید کی راہ ہے اور اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان کے پہلو سے ہے۔

'ذٰلک ھدی اللہ' یعنی یہی ہدایت جو ان تمام نبیوں کو اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ راہ اللہ اپنے ان بندوں پر کھولتا ہے جن کے لیے چاہتا ہے۔ 'جن کے لیے چاہتا ہے' سے اشارہ اسی سنت اللہ کی طرف ہے جو اس نے ایمان و ہدایت کے لیے مقرر کر رکھی ہے، اس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بھی، جن کو اللہ نے یہ مرتبے عطا فرمائے اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو کے رہ جاتا۔ مجرد اس بنیاد پر ان کی برگزیدگی نہ ہوتی کہ یہ نوحؑ یا ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لئے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لئے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انہیں ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو درکنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں ان کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔

'اولٰئک الذین اٰتینٰھم الکتٰب والحکم والنبوۃ الاٰیۃ' کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ قرآن میں اکثر آیا ہے، یہاں 'حکم' کا لفظ ہے۔ مولانا فراہیؒ اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ 'حکم' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکم سے مراد صحیح فہم اور صحیح فہم کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہی چیز جب پختہ ہو کر ایک ملکہ راسخہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے تو اس کو حکمت کہتے ہیں۔ حکم اور حکمت، کتاب الٰہی کے لوازم میں سے ہیں اس لئے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی زندگی کے معاملات میں رہنمائی دینا ہے، عام اس سے کہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اور عام اس سے کہ پیش آمدہ صورت معاملہ صریحاً کتاب میں بیان ہوئی ہو یا اجتہاداً و استنباطاً اس کا حکم نکالنا پڑے۔ کتاب کی طرح یہ حکم بھی عطیۂ الٰہی ہے اور اسی سے کتاب الٰہی زندگی کی ایک عملی حقیقت بنتی ہے۔ اگر حاملین کتاب اس چیز سے محروم ہو جائیں تو پھر کتاب زندگی کے معاملات و مسائل سے بے تعلق ہو کر محض ایک ایسی تاریخی دستاویز بن کے رہ جاتی ہے جو نوادرات کے کسی عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ (جن کا اوپر بیان ہوا) ہیں جن کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت کی نعمت سے سرفراز کیا اور انہوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ اب انہی نعمتوں سے ہم نے تمہارے واسطہ سے (اشارہ پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے) ہم نے ان لوگوں کو (اشارہ اہل مکہ کی طرف ہے) نوازنا چاہا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ یہ اس نعمت کی قدر کرتے لیکن یہ لوگ اس نعمت کی اگر ناقدری کرتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو، ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مقرر کر دیا ہے جو اس کے انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ 'وکلنا بہا' میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ ضامن اور امین بنائے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ب' اس پر دلیل ہے۔ 'قوماً' سے مراد یہاں صحابہؓ کی وہ جماعت بھی ہے جو اس وقت تک داخل اسلام ہو چکی تھی اور وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے بعد میں اس کے حاملین میں داخل ہونا مقدر تھا، اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک وہ ان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس ٹکڑے میں صحابہؓ کی استقامت اور مستقبل میں امت کی کثرت کی پیشینگوئی ہے اور اس پہلو سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اس دور میں آپؐ کو دی گئی، جب آپؐ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیر الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اس کے لیے کھڑا کر دیا ہے ان کی قلت تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔

'اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ' میں 'ف' وقف اور سکتہ کی ہے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے سرفراز فرمایا تو تم انہی کے نقش قدم پر چلو اور انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔ رہے یہ لوگ جو مدعی تو ہیں ابراہیمؑ کے وارث ہونے کے لیکن پیروی کر رہے ہیں شیطان کی اور تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان سے کہہ دو کہ میں اس پر کوئی معاوضہ تو تم سے مانگ نہیں رہا ہوں کہ تم اس کا بوجھ محسوس کر رہے ہو۔ میں نے اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔ اگر قبول کرو گے تو تمہارا نفع ہے، رد کرو گے تو خود محروم رہو گے۔ یہ اللہ کے دین کی دعوت ہے، یہ کوئی تجارت اور دکانداری نہیں ہے کہ تم گاہک نہ بنے تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

'ان ھو الا ذکرٰی للعٰلمین' میں 'ھو' کا مرجع قرآن ہے اور یہ اسی مضمون کی مزید توضیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن تو خلق لوگوں کے لیے ایک تذکیر اور ایک یاددہانی ہے۔ پیغمبر نے اگر یہ یاددہانی پہنچا دی تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا، اگر لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس کا انجام وہ خود دیکھیں گے، پیغمبر پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول ہی کر لیں۔ قرآن کے لیے 'ذکرٰی' کے لفظ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے بلکہ انہی حقائق کی یاددہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن لوگوں نے ان کو اپنی خواہشات

و بدعات کے پیچھے دبا دیا ہے۔ دوسری اس حقیقت کی طرف کہ یہ اسی ہدایت الٰہی کی یاددہانی کر رہا ہے جو نوحؑ، ابراہیمؑ اور تمام انبیاء دے کر آئے لیکن ان کے ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اسی ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کر لیں اور انہی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی۔ پس جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔

الحمدللہ

کہ مولانا امین احسن اصلاحی کی بائیں آنکھ کا سفید موتیا کا آپریشن ۲۳ اپریل کو میو ہسپتال لاہور میں بخیر و خوبی ہو گیا۔ قارئین 'میثاق' سے استدعا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مولانا کی کامل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

(منیجر 'میثاق')

ہم سے طلب فرمایئے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

• اسلامی قانون کی تدوین
صفحات ۱۶۰ : قیمت ۳ روپے
سستا ایڈیشن : ″ ۲ ″

• تزکیۂ نفس
صفحات : ۳۴۴
قیمت : ۶/- روپے

• تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ
بڑا سائز : صفحات : ۳۶
ہدیہ : ۷۵ پیسے

دارالاشاعت الاسلامیہ - کوثر روڈ، اسلام پورہ - لاہور

ہم سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا فراہیؒ

تفاسیر

التکمیل فی اصول التاویل (عربی) سائز ۲۶x۲۰ صفحات ۸۲ : طباعت ٹائپ : قیمت ۴.۰۰ روپے
دلائل النظام (عربی) سائز ۲۶x۲۰ صفحات ۱۲۲ طباعت ٹائپ، کاغذ عمدہ سفید : قیمت ۵.۰۰ روپے

مقدمہ تفسیر نظام القرآن (اردو ترجمہ) قیمت	۰.۹۰
تفسیر بسم اللہ وسورہ فاتحہ " "	۴.۰۰
" سورہ قیامہ " "	۰.۶۰
" والشمس " "	۰.۵۰
" فیل " "	۱.۰۰
" ذاریات " "	۱.۳۰
" مرسلات " "	۰.۶۰
" والتین " "	۰.۷۰
" کوثر " "	۱.۱۰
" لہب " "	۰.۷۰
" تحریم " "	۰.۷۰
" عبس " "	۰.۷۰
" والعصر " "	۰.۶۰
" کافرون " "	۰.۴۵
" اخلاص " "	۰.۴۵
اقسام القرآن " "	۰.۳۰
ذبیح کون ہے؟ " "	۰.۷۰

لغت وادب

اسباق النحو
حصہ اول : ۱.۵۰ روپے
" دوم ۱.۱۵ "

تحفۃ الاعراب
قیمت : ۰.۲۵ "

امثال آصف الحکیم
قیمت : ۱.۲۵ "

جمہرۃ البلاغ
قیمت : ۱.۵۰ "

مفردات القرآن
قیمت : ۱.۴۰ "

دیوان عربی
قیمت : ۱.۵۰ "

نوائے پہلوی دیوان فارسی
قیمت : ۴.۰۰ روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور ۱، ٹیلیفون نمبر ۶۶۵۲۲

افادات امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی

محمد مقبول عالم بی اے، جائنٹ سیکرٹری، ولی اللہ سوسائٹی، لاہور

عیاشانہ معیارِ زندگی

قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر، بلکہ راہ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بیجا اور فضول خرچ کرنا۔

(۱) وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (۷ : ۳۱)
کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷ : ۲۶-۲۷)
اور بے جا خرچ نہ کرو۔ بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

(۳) وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ (۱۷ : ۲۹)
اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ کر نہ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے ورنہ تو پشیمان خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جائے گا۔

(۴) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (۲۵ : ۶۷)
اور (رحمٰن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں حکیم الامت امام ولی اللہ دہلویؒ نے معاشرے کے معیار زندگی پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیار زندگی پائے جاتے ہیں:

(۱) رفاہیت بالغہ یعنی عیاشانہ معیار زندگی۔ جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی جاتی ہے۔ اس طرح حد سے زیادہ بلکہ اکثر بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

(۲) رفاہیت ناقصہ یعنی پست معیار زندگی۔ جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتیں۔ وہ

جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

(۳) رفاہیتِ متوسطہ یعنی درمیانہ معیارِ زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے لئے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

امام صاحبؒ رفاہیت بالغہ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"اللہ تعالےٰ نے رفاہیت بالغہ (عیاشی) کو ناپسند کیا ہے اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان طلبِ دنیا کے ہی اندر الجھ کر رہ جائے، اور معیشت کی باریکیوں میں اتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعمق اور غلو کرنے لگے۔ چنانچہ ریشم اور سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن، گلوبند، ہار، طوق، پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی تاریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنےٰ سے اعراض کیا جائے۔ لیکن رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس میں سے سب سے اعلیٰ کا انتخاب کیا جاتے ہے"

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲۔ صفحہ ۱۰۷)

رفاہیت ناقصہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ عموماً ان لوگوں کا معیارِ زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دور پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے (حجۃ اللہ البالغہ ج ا صفحہ ۱۰۴) شہروں کے وہ لوگ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیں مگر انہیں پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیئے جاتے ہیں جس سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی سی ہو جاتی ہے جن سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لئے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے اور نہ وہ سعادتِ اخرویہ کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں بلکہ ان میں سعادتِ اخرویہ کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت کر سکے (حجۃ اللہ البالغہ ج ا صفحہ ۱۰۶)

رفاہیت متوسطہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ معیارِ زندگی ہے جس میں دنیوی کاروبار بھی ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ عبادات و اذکار کا پروگرام بھی ہوتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے فرصت بھی پاتا ہے (حجۃ اللہ البالغہ جلد ا صفحہ ۱۰۴)

رفاہیت بالغہ والے عیش پرستی میں مگن رہتے ہیں اس لئے انہیں کسی حاجت مند کی ضروریات اور تکالیف کا علم ہی نہیں ہوتا اور نہ وہ معاشرے کی بہتری و بھلائی کے لئے غور و فکر کرتے ہیں۔ ایسے ہی رفاہیت ناقصہ والے ضروریات زندگی فراہم کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور انہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ رفاہِ عام اور آخرت کی بھلائی کے لئے کوئی کام کر سکیں۔ یہ دونوں طبقے بیکار ہو جاتے ہیں۔ البتہ رفاہیت متوسطہ والے کچھ فراغت پاتے ہیں اور معاشرے

کی بہتری اور بھلائی کا احساس رکھتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جس میں رفاہیت بالغہ اور ناقصہ والے زیادہ ہوں، اور رفاہیت متوسطہ والے کم ہوں، ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے معیارِ زندگی کو متوسط درجے پر لایا جائے تاکہ معاشرہ ترقی کرے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ ایسا نظام پیدا کیا جائے جس کے ذریعے سے معاشرے کے اندر دولت کی تقسیم متوازن ہو جائے اور رفاہیت بالغہ پیدا ہی نہ ہو۔ تاکہ سب رفاہیت متوسطہ میں آ جائیں اگرچہ رفاہیت متوسطہ میں بھی درجے ہوں گے۔ لیکن ان میں اتنا فرق نہیں رہے گا جتنا بالغہ اور ناقصہ میں تھا۔

ہم سے طلب فرمائیے

احادیثِ نبویؐ کا ایک نیا اور جامع انتخاب

"معارفُ الحدیث"

مع اُردو ترجمہ و تشریح ——— از مولانا محمد منظور نعمانی مدیرِ الفرقان لکھنؤ

احادیثِ نبویؐ کا محفوظ ذخیرہ اُمّت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے قائم مقام ہے۔ ایک صاحبِ ایمان اس کے مطالعہ کے وقت تصور کے راستے سے مجلسِ نبویؐ میں پہنچ جاتا ہے آپ کے ارشادات سنتا ہے اور آپ کے اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کو دیکھتا ہے ——— مولانا نعمانی نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں اُمّت کے لئے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ پھر ان کی ترتیب اور ترجمہ و تشریح میں زمانہ کی نفسیات اور آج کے فکری ماحول کو خاص طور سے سامنے رکھا اور عالمانہ یا مدرسانہ بحثوں کی بجائے مطمح نظر یہ رکھا کہ پڑھنے والے کا ذہن مطمئن اور دل متاثر ہو اور اس میں اتباع کا جذبہ اور کسی درجہ میں وہ ذوق عمل پیدا ہو جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں آپ کے ارشادات سے پیدا ہوتا تھا ——— الحمد للہ اس سلسلے کی چار جلدیں عمدہ سفید کاغذ اور بڑے کتابی سائز پر حسین کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

جلد اوّل : کتاب الایمان ۲۸۸ صفحات قیمت ۲۰/۰۰ روپے جلد دوم : کتاب الرقاق والاخلاق ۳۴۰ صفحات قیمت ۰۰/۰۰

جلد سوم : کتاب الطہارت والصلوٰۃ ۳۹۴ صفحات قیمت ۰۰/۰۰ روپے جلد چہارم : کتاب الزکوٰۃ والصوم والحج ۱۹۶ ۰۰/۰۰

ہر جلد کے شروع میں مقدمہ ہے جو بجائے خود علمی و عرفانی تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔

نوٹ : محصول ڈاک اس کے علاوہ ہوگا۔

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ۔ اسلام پورہ۔ لاہور ۱

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

اسرار احمد

• فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء • بنیادی نقطۂ نظر • عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش • مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل • علومِ عمرانی کا ارتقاء • اسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں • تعمیری کرتا ہی۔ • احیائے اسلام کی شرطِ لازم: تجدیدِ ایمان • کرنے کا اصل کام • عملی اقدامات اور

مضامین مندرجہ بالا کے تائید و توثیق بعنوان

"فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم پروفیسر یوسف سلیم چشتی

"دونوں مقالے ماہنامہ میثاق (لاہور) میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دونوں فکر انگیز ہیں اور ایک طرف جوش و اخلاص دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی

صدق جدید لکھنؤ، ۷ فروری ۱۹۶۹ء

سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۵۶۔ طباعت آفسٹ۔ قیمت ایک روپیہ

شائع کردہ

دارالاشاعتِ الاسلامیہ کوثر (سابقہ امرت) روڈ، اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور۔ فون نمبر ۶۹۵۲۲

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں

شہریوں کے معاشی حقوق

(زیرِ طبع کتاب "اسلامی ریاست" کے ایک باب سے)

۱۔ تقسیمِ فے میں مساوات بیت المال میں فے[1] کی جو آمدنی ہوگی اس میں ہر مسلمان برابر کا شریک ہے۔ وہ یا تو مسلمانوں کے مشورے سے ان کے اجتماعی بہبود کے کاموں میں صرف ہوگی۔ اور یہ کام لازمی طور پر ایسے ہی ہوں گے جن سے سوسائٹی کے ہر طبقہ کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے۔ یا ان کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دی جائے گی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب اس شعبہ کی آمدنی زیادہ تھی اور حکومت کے مصارف کم تھے، اجتماعی ضروریات سے جو رقم پس انداز ہوتی مسلمانوں میں تقسیم کر دی جاتی۔ تقسیم کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ تمام رقم مسلمانوں میں بغیر کسی امتیاز کے برابر برابر تقسیم کر دیتے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اشخاص کی اسلامی خدمات کو پیشِ نظر رکھ کر اس تقسیم میں کچھ فرق کیا، لیکن بعد میں وہ بھی اس معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مذہب پر آ گئے تھے اگرچہ اپنی زندگی میں اس کو عملاً جاری کرنے کا موقع نہ پا سکے۔ انہوں نے مسلمانوں کے اس دستوری حق کا ایک موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ میں اعلان فرمایا:-

[1] فے سے مراد ان دولت کی آمدنیاں ہیں جو اسلامی سوسائٹی کے کسی خاص حصّہ (مثلاً غرباء و مساکین) کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ شہریت کے شرائط کے سلسلہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ صرف وہ مسلمان فے میں حصّہ پانے سے محروم تھے جو ان علاقوں میں پڑے رہ گئے تھے جو ابھی پوری طرح اسلامی اقتدار کے تحت نہیں آئے تھے۔

"اس مال (مالِ فے) میں کوئی شخص کسی سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔ میں بھی اس میں سے کسی سے کچھ زیادہ لینے کا حق نہیں رکھتا ...... اور خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کے پہاڑوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چرا رہا ہوگا اس کو بھی اس مال میں سے اس کا حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی، وہ بدستور اپنی جگہ بکریاں چرا رہا ہوگا۔" (کتاب الخراج ص۵۰)

ایک اور موقع پر مسلمانوں کے شہری حقوق بیان کرتے ہوئے اس حق کا انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار فرمایا:—

لكم علي ان لا اجتبي من خراجكم ولا مما افاء الله عليكم الا من وجهه ولكم علي اذا وقع في يدي الا يخرج مني الا في حقه (الفاروق عمر محمد حسین ہیکل صفحہ [illegible])

میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور فے کو نہ وصول کروں مگر ان کے جائز طریقوں سے اور میرے اوپر تمہارا یہ بھی حق ہے کہ جب وہ میرے قبضہ میں آ جائیں تو ان کو نہ صرف کروں مگر ان کے جائز مصرف میں۔

حضرت علیؓ نے اپنے دور میں تقسیم فے میں بالکل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نقش قدم کی پیروی کی یعنی حکومت کی ضروریات سے جو رقم پس انداز ہوتی وہ تمام مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم فرما دیتے۔

وكان علي رضي الله عنه يسير في الفئ سيرة ابي بكر الصديق في القسم اذا ورد عليه مال لم يبق منه شيئا الا قسمه. ولا يترك في بيت المال منه الا ما يعجز عن قسمته في يومه ذلك ...... ولم يكن يستاثر من الفئ بشيء ولا يخص به حميما ولا قريبا (الاستیعاب ابن عبد البر جلد ۲ صفحہ ۴۶۳)

اور حضرت علیؓ فے کی تقسیم کے معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طریقہ پر چلتے تھے جب ان کے پاس کوئی مال آتا تو جو رقم اجتماعی ضروریات سے بچ رہتی اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے۔ اس میں سے بیت المال میں اگر کوئی رقم پڑی رہ جاتی تو صرف وہ رقم پڑی رہ جاتی جو اس دن کسی وجہ سے تقسیم نہ ہو سکی ہوتی ...... وہ اس مال میں سے نہ بیجا طور پر خود اپنے اوپر خرچ کرتے اور نہ خلاف استحقاق اپنے کسی دوست اور کسی عزیز کو دیتے۔

۲۔ ہر حاجت مند کی کفالت

اسلامی ریاست ہر اس شہری کی کفیل اور اس کی ضروریات کی ذمہ دار ہے جس کا کوئی کفیل اور ذمہ دار نہ ہو۔ ریاست پر یہ اجتماعی ذمہ داری ایک اہم اجتماعی حق کے بدلہ میں ڈالی گئی ہے۔ اسلامی قانون کی رُو سے ریاست ہر اس شہری کی وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو، اس وجہ سے وہ لازمی طور پر اس کی کفیل اور ذمہ دار بھی بنائی گئی ہے اگر اس کا کوئی کفیل نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:—

انا وارث من لا وارث له، اعقل له وارثه (ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)

میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں اس کی جانب سے دیت ادا کروں گا (اگر اس کے ذمہ واجب الادا ہوگی) اور اس کی وراثت لوں گا (اگر اس نے چھوڑی ہوگی)

اس حدیث کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:—

وقالوا كما يرثه اذا مات ولم يدع وارثا فكذلك يعقل عنه ويديه اذا مات ولم يدع وفاء وكذلك ينفق عليه في حياته اذا لم يكن من ينفق عليه (زاد المعاد۔ جلد ۱ ص[illegible])

اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جبکہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی شے چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لیے بھی ذمہ دار ہوگی جبکہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں اس اجمال کی تفصیل یہ ہوئی کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی املاک و جائداد پر ریاست قابض ہوگی، دوسروں کے ذمہ اگر اس کا کوئی بقایا ہے تو ریاست اس کو وصول کر کے اپنے تصرف میں لائے گی۔ اگر اس کی کوئی دیت اب تک وصول نہیں ہوئی تھی تو اب وہ ریاست کے خزانہ میں منتقل ہوگی۔ ان حقوق کے بارے میں ریاست ہر شہری کے متعلق، ان حقوق کے بالکل ہموزن، یہ ذمہ داری قبول کرے گی کہ اگر وہ کوئی قرض چھوڑ کر مر جائے گا اور اس کی ادائیگی کے لیے کوئی نقد و جنس نہیں چھوڑے گا تو ریاست اس کا قرضہ ادا کرے گی، اگر وہ اپنے ذمہ کوئی خون بہا چھوڑ کے مر جائے گا تو ریاست اس کی ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی اور اگر زندگی میں کفالت کا محتاج ہے اور اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا کوئی کفیل نہیں ہے تو ریاست لازماً اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی

تمام ضروریات کی کفیل ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے ریاست کی اسی ذمہ داری کو پیش نظر رکھ کر فرمایا تھا کہ:۔

اما والله لئن بقیت لارامل اهل العراق لادعنهم لا یفتقرون الی امیر بعدی
(کتاب الخراج صفحہ ۲۱)

خدا کی قسم اگر میں اہلِ عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امیر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی

خلفائے راشدین اس ذمہ داری کو جس مستعدی و سرگرمی اور جس فیاضی کے ساتھ بلا کسی تاخیر اور بغیر کسی ٹال مٹول کے ادا کرتے تھے اور ہر ضرورت مند جس اعتماد کے ساتھ ان کی حکومت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا تھا اس کو واضح کرنے کے لیے ہم بطور مثال یہاں دو واقعے نقل کرتے ہیں:۔

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ساتھ بازار کی طرف جا نکلا۔ وہاں ایک نوجوان عورت حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور بولی کہ اے امیرالمومنینؓ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے، اس نے بچے چھوڑے ہیں جو ابھی اتنے چھوٹے ہیں کہ اپنا لقمہ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں اٹھا سکتے، ان کے باپ نے نہ زمین چھوڑی ہے، نہ مویشی، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ بچے کسمپرسی کی نذر نہ ہو جائیں، میں خفاف بن ایماء غفاری کی بیٹی ہوں میرے باپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے۔ حضرت عمرؓ اس کی بات سن کر وہیں کھڑے ہو گئے، اس قریبی تعلق پر مسرت کا اظہار فرمایا، پھر ایک اونٹ پر گیہوں کی بوریاں لدوائیں، کچھ نقدی اور کچھ کپڑے اس کے ساتھ رکھوائے اور پھر اس کی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر فرمایا کہ اس کو لے جاؤ۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے تیرے پاس مزید سامان پہنچ جائے گا۔[1]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات میں گشت کر رہے تھے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک عورت آگ پر ہانڈی چڑھائے ہوئے کچھ پکا رہی ہے اور اس کے بچے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت فرمایا کہ یہ آگ پر کیا پک رہا ہے اور یہ بچے رو کیوں رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ بھوکے ہیں اس وجہ سے رو رہے ہیں اور میں نے ان کو بہلانے کے لیے یہ آگ پر پانی چڑھا رکھا ہے۔ میرے اور عمرؓ کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر

[1] بخاری شریف۔ باب غزوۃ الحدیبیہ

فوراً بھاگے ہوئے بیت المال میں آئے۔ آٹے کی بوری پیٹھ پر لادی اور اسی وقت اس کے جھونپڑے میں پہنچے۔ خود اس کے چولہے کے پاس بیٹھ گئے اور آگ پھونکتے رہے۔ جب کھانا تیار ہو گیا اور بچے کھا پی کر سو گئے تو وہاں سے واپس لوٹے اور بار بار تاثر کے ساتھ یہ فقرہ دہراتے رہے کہ یہ بچے بھوک کے سبب سے رو رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے جاگ رہے تھے۔[1]

۳۔ ناقابلِ ادا قرضوں کی ادائیگی

جس طرح ریاست ہر شہری کی ضروریات کی کفیل ہے اگر اس کا کوئی کفیل نہ ہو، اسی طرح ریاست ہر قرضدار کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اگر وہ مر گیا اور اس قرضہ کی ادائیگی کے لئے اس نے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ اس ذمہ داری کی بنیاد بھی وہی حق ہے جو ریاست کو ہر شہری پر حاصل ہوتا ہے اور جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من ترک کلا فالی ومن ترک مالا فلورثته وانا وارث من لا وارث له، اعقل له وارثه
(ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)

جس نے کوئی بار چھوڑا تو وہ میرے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اس کی دیت ادا کروں گا اور اس کا وارث ہوں گا۔

علامہ ابن قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق علماء کی یہ رائے نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذمہ داری اسلامی حکومت کے حکمران کی حیثیت سے اٹھائی ہے اس وجہ سے یہ آپ کی ذات تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری بن گئی ہے اور ہر حکومت جو اسلامی قوانین پر مبنی ہوگی وہ لازماً مسلمانوں کے اس قسم کے قرضوں کی ضامن ہوگی۔

وقد قیل ان هذا الحکم عام للائمة بعده فالسلطان ضامن لدیون المسلمین اذا لم یخلفوا وفاء فانها علیه یوفیها من بیت المال۔

اور کہا جاتا ہے کہ یہ قانون کچھ آپؐ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپؐ کے بعد آنے والے خلفاء اور ائمہ کے لیے عام ہے۔ سلطان (حکومت) ہر اس مسلمان کے قرضہ کا ضامن ہے جو اپنے قرضہ کی ادائیگی کے

[1] الفاروق عمر۔ تالیف محمد حسین ہیکل صفحہ ۲۱۶۔

وقالوا كما يرثه إذا مات ولم يدع وارثا فكذلك يقضي عنه دينه إذا مات ولم يدع وفاء

(زاد المعاد جلد ا صفحہ ۵۰)

لئے کوئی چیز چھوڑے بغیر مر جائے۔ یہ قرضہ اس کے ذمہ ہے اور وہ بیت المال سے اس کو ادا کرے گا۔ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جس طرح سلطان اس کا وارث ہوتا ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو اسی طرح اس کو اس کے قرضے کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی ہونا چاہئے جب وہ اس کی ادائیگی کے لئے کوئی چیز چھوڑے بغیر مر جائے۔

۴۔ بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف

اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و تعدی سے بچائے اور اس امر کا انتظام کرے کہ کوئی شخص غریب ہو یا امیر، بے اثر ہو یا با اثر، یکساں طور پر، بغیر کوئی قیمت ادا کئے انصاف حاصل کر سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہریوں کے اس حق کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا تھا:۔

ولست أدع أحدا يظلم أحدا أو يتعدى عليه حتى أضع خده على الأرض وأضع قدمي على الخد الآخر حتى يذعن للحق

میں کسی شخص کو اس بات کا موقع نہیں دوں گا کہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی پر زیادتی کر سکے جو شخص ایسا کرے گا میں اس کا ایک گال زمین پر رکھوں گا اور اس کے دوسرے گال پر اپنا پاؤں رکھوں گا، یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھک جائے۔

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں ایسے بلیغ انداز سے ظاہر فرمایا ہے کہ اس کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ فرماتے ہیں:۔

والله ما فيكم أقوى عندي من الضعيف حتى آخذ له الحق ولا أضعف عندي من القوي حتى آخذ الحق منه۔

خدا کی قسم میری حکومت میں ایک بے اثر سے زیادہ با اثر کوئی نہیں ہے جب تک میں اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں اور ایک با اثر سے زیادہ بے اثر کوئی نہیں ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کر لوں۔

حضرت عمر کا یہ ارشاد نہایت اہم ہے اور یہ بات صرف انہی نے نہیں فرمائی ہے بلکہ ان سے پہلے کم و بیش

انہی الفاظ میں یہی بات حضرت ابوبکر صدیق رضی نے بھی فرمائی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

الضعيف فيكم قوي عندي حتى أريح عليه حقه إن شاء الله والقوي فيكم ضعيف عندي حتى آخذ الحق منه إن شاء الله[1]

تمہارے اندر جو بے اثر ہے وہ میرے نزدیک با اثر ہے یہاں تک کہ میں اس کا چھنا ہوا حق اس کو واپس دلا دوں اور تمہارے اندر جو با اثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے اس حق کو وصول کر لوں جو اس نے غصب کر رکھا ہے۔

ان دونوں بزرگوں کا ایک ہی پہلو پر اس شد و مد سے زور دینا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی اہمیت پر خاص طور سے غور کیا جائے۔ جہاں تک ہر شہری کے لیے انصاف مہیا کرنے کا تعلق ہے یہی دعوٰے اس زمانے کی جمہوری حکومتیں بھی کرتی ہیں لیکن انہوں نے انصاف حاصل کرنے کے لیے جو نظام بنائے ہیں وہ ایسے بنائے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے اگر انصاف حاصل کر سکتے ہیں تو وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے نہایت وسیع وسائل و ذرائع رکھتے ہوں بے اثر اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے ان کے اندر انصاف حاصل کر سکنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے نظام عدالت کی جس خاص خصوصیت پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دروازہ ایک غریب اور ایک امیر، ایک با اثر اور ایک بے اثر دونوں کے لیے یکساں کھلا ہوا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ صرف سونے اور چاندی کی کنجیوں ہی سے کھل سکتا ہو اور جن کے پاس سونے اور چاندی کی یہ کنجیاں موجود نہ ہوں وہ اس کے اندر بار ہی نہ پا سکتے ہوں۔ اس نظام کی تشکیل دکانداری کے اصول پر نہیں ہوئی ہے کہ اس کے اندر ان لوگوں کا تو خیر مقدم ہو جو گرہ میں مال رکھتے ہوں اگرچہ وہ مظلوم ہونے کے بجائے ظالم ہی ہوں اور وہ دھکے کھاتے پھریں جو مفلس اور نادار ہوں اگرچہ ان کے اوپر کتنا ہی بڑا ظلم ڈھایا گیا ہو۔ اس نظام کے اندر سارا احترام حق اور صرف حق کے لئے ہے۔ اگر ایک شخص کا حق چھینا گیا ہے تو مجرد یہ بات کہ وہ مظلوم ہے اس کو حقدار بنا دیتی ہے کہ وہ اسلامی نظام قضا کی ایک چھوٹی سے چھوٹی عدالت سے لے کر اس کے ہائیکورٹ اور اس کے سپریم کورٹ تک سب کو متحرک کر دے۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے نہ کورٹ فیس کا کوئی سوال ہے نہ وکالت کی فیس کا، صرف

[1] سیرۃ الصدیق ابی بکر۔ محمد حسین ہیکل صفحہ ۶۷۔

یہ بات کہ وہ مظلوم ہے اور دادرسی کا محتاج ہے اس کی امداد کے لیے پورے نظام کو اس وقت تک سرگرم کار کردے گی جب تک اس کی دادرسی کا حق ادا نہ ہو جائے۔

۵۔ تعلیم جہاں تک ابتدائی اور ضروری تعلیم کا تعلق ہے ریاست ہر شہری کے لئے خود اس کا انتظام کرے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بدر کی لڑائی میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ نے یہی قرار دیا کہ وہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ بعض لوگوں کے لیے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا بھی اہتمام کیا گیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلہ میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔ بالغ عوام میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے۔ مدینہ سے باہر کے مسلمانوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے کچھ ذی صلاحیت افراد مدینہ بھیجتے رہیں تاکہ وہ وہاں سے تعلیم حاصل کر کے لوٹیں تو اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں۔ باہر سے جو وفود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ان میں سے جن افراد کے اندر آپ ذہانت و صلاحیت دیکھتے ان کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر فرما دیتے۔ جو لوگ سرکاری عہدوں پر مقرر ہوتے ان کے فرائض کا سب سے اہم حصہ یہی ہوتا کہ وہ لوگوں میں تعلیم پھیلائیں۔ عمرو بن حزمؓ کو آپ نے یمن کا گورنر بنایا تو ان کو ان کے فرائض سے متعلق جو ہدایات دیں ان میں سب سے مقدم یہ ہدایات تھیں :-

...... اور اس کو یہ ہدایت کی کہ وہ حق پر قائم رہے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور بھلائی کا حکم دے اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کرے اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکے .... اور لوگوں کی دلداری کرے یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں ....[1]

تعلیم کی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے سوسائٹی کے ہر شعبہ میں شرف و تقدم کا معیار علم کو قرار دے دیا گیا ہے تاکہ لوگوں میں اس کے لیے مسابقت کا جذبہ پیدا ہو۔ مسجد کی امامت سے لے کر ریاست کے اونچے سے اونچے عہدوں پر مقرر کرتے وقت جو چیز سب سے پہلے دیکھی جاتی وہ صرف

[1] ابن ہشام مطبوعہ مصر۔ جلد ۱ صفحہ ۲۴۱

یہ تھی کہ جس شخص کو مقرر کیا جا رہا ہے قرآن کے علم اور پیغمبر کے طریقہ سے وہ کس حد تک واقف ہے۔ بسا اوقات دو نوجوانوں میں تمام وجوہ فضیلت بالکل مساوی ہوتے لیکن ان میں سے ایک نوجوان کو صرف اس بنا پر ترجیح دے دی جاتی کہ وہ دوسرے کی نسبت قرآن سے کچھ زیادہ واقف ہوتا۔ قرآن مجید کی چند آیتوں کا یاد ہونا کبھی ایک نادار شخص کے واسطے اس بات کے لئے کافی ہو جاتا کہ اسی چیز کو اس کی بیوی کا مہر قرار دے دیا جائے۔ یہ سارے طریقے محض اس لیے اختیار کئے گئے کہ لوگ جاہلی اقدار سے بے رغبت ہو کر اسلامی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس مہم کو تیز سے تیز تر کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ تعلیم بالغان کے پروگرام کو اس سرگرمی اور جوش کے ساتھ آگے بڑھایا کہ شاید ہی اس کی نظیر اور مثال مل سکے۔ خلافت کی گوناگوں اور عظیم الشان مصروفیتوں کے باوجود اس چیز سے ان کی ذاتی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ سفر شام کے دوران میں بھی کسی منزل میں، قوم کی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے۔ جہاں کہیں ان کو جاہل اور بے خبر مسلمان مل جاتے دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم کو بھی جاری رکھتے۔ تمام عہدہ داروں کو تحصیلداروں سے لے کر گورنروں تک — یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنے فرائض میں سب سے مقدم لوگوں کی تعلیم کو رکھیں۔ اس چیز کا اظہار انہوں نے اپنے خطبوں میں بار بار فرمایا۔ ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا :-

اللّٰهم انی اشهدك على امراء الامصار فانی انما بعثتهم ليعلموا الناس دينهم وسنة نبيهم	اے اللہ میں اپنے تمام علاقوں کے عہدیداروں پر تجھ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے ان کو اس لئے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین اور ان کے نبی کے طریقہ کی تعلیم دیں۔

ایک دوسرے خطبہ میں عوام کو اپنے عہدہ داروں کے فرض منصبی سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا :-

ولكنی استعملتهم عليكم ليعلموكم كتاب ربكم وسنة نبيكم	میں نے ان کو اس لئے مقرر کیا ہے کہ تم کو تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی تعلیم دیں۔

ان تعلیمی سرگرمیوں کا یہ فیض تھا کہ عرب جیسی جاہل قوم ۲۵ - ۳۰ سال کے اندر اندر اس قابل ہو گئی کہ افغانستان کی سرحدوں سے لے کر مصر و شام کے حدود تک اپنے نصب العین کے مطابق حکومت کرنے کے لیے اس کو کسی شعبہ میں معیاری آدمیوں کی کمی کبھی نہیں محسوس ہوئی۔

اپنے موضوع پر قول فیصل
لِيُحِقَّ الحَقَّ وَ يُبْطِلَ الباطِلَ

"تحقیقِ اسلامی کا مفہوم مدّعا اور طریقِ کار"

یعنی

ہمارے ملک کے اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے

کرنے کا اصل کام

تالیف
ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

"..... محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے اس مقالے سے میرے دل کو سب سے زیادہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔ میرے نزدیک اسلامی ریسرچ کا صحیح تصور یہی ہے جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے ....."

مولانا امین احسن اصلاحی

"..... اس موضوع پر میری نظر سے اس سے زیادہ تشفی بخش تحریر اب تک نہیں گزری .... اسلامی موضوعات پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتابچہ ایک دستور العمل کا درجہ رکھتا ہے ....."

ڈاکٹر سید عبداللہ، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

کتابت وطباعت دیدہ زیب : قیمت قسم اعلیٰ ڈیڑھ روپیہ
قسم ادنیٰ ایک روپیہ۔ محصول ڈاک اس کے علاوہ

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ / اسلام پورہ **لاہور ۱**

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

منشورِ اسلام

["اسلامی تحقیق" کے موضوع پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ جو چار قسطوں میں "میثاق" میں شائع ہوا ہے، قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اس کا حاصل یہ تھا کہ مغرب کے غلط فلسفیانہ نظریات (مثلاً سیکولرزم، فرائڈ ازم، ایڈلرزم، میکڈوگلزم اور مارکسزم وغیرہ) جو اس وقت پوری نوعِ انسانی پر مسلط ہو چکے ہیں، اسلام کو ایک زبردست علمی چیلنج دے رہے ہیں اور جب تک مسلمان اس چیلنج کا مسکت جواب نہیں دیتے اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لئے راستہ صاف نہیں ہو سکتا اور مسلمان قیادتِ اقوام کے اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جو خدا نے اپنے ان ارشادات میں ان کو سونپا ہے کہ تم دنیا کی بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی راہنمائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے (كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ... الآیہ) اور تم کو تاریخِ انسانی کے درمیانی دور میں پیدا کیا گیا ہے تاکہ ایک طرف تم خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے تمام گذشتہ انبیاء کی تعلیمات کے کمال کے حاملین قرار پاؤ اور دوسری طرف اپنے اس امتیاز کی بنا پر آنے والی انسانی نسلوں کے لئے اسی طرح کامیاب راہنما ہو جس طرح رسول تمہارا راہنما ہے (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝)

ان نظریات کا کافی اور شافی جواب اس لئے بھی ضروری ہے کہ خود مسلمان ان سے مرعوب ہو رہے ہیں اور خدا کے دین پر اُن کا اعتقاد مضمحل ہو رہا ہے اور اس طرح سے یقین و ایمان کی وہ بنیاد بھی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس پر خدا نے نوعِ انسانی کی راہنمائی کا دار و مدار رکھا ہے۔ یعنی اُمتِ مسلمہ کا ایمان۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تحریک پر سب سے پہلے خود عمل کیا ہے۔

اس سلسلے میں اُن کی بنیادی کتاب انگریزی میں ہے جس کا نام "مستقبل کا نظریۂ حیات" (IDEOLOGY OF THE FUTURE) ہے جو آج سے تقریباً پچیس سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا استدلال مغرب کے فلسفیانہ نظریات کی تردید ہی نہیں کرتا بلکہ "لِيُحِقَّ الحَقَّ وَيُبْطِلَ الباطِلَ" کے مصداق، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے پڑھنے والوں کو اس نتیجہ

یہ پہنچاتا ہے کہ فطرت انسانی کے بے پناہ اور لازوال قوانین کے عمل سے جو نظریہ حیات بالآخر پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا وہ اسلام کے سوائے کوئی اور نہیں۔ ایک نامور مغربی فلسفی ڈاکٹر ڈبلیو للی (DR. W. LILLIE) کی رائے کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں میکڈوگل، فرائڈ اور ایڈلر کے نظریات کا آخری (FINAL) جواب لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب پر پنجاب یونیورسٹی نے مغرب کے سربرآوردہ فلسفیوں کی سفارش پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ اگرچہ للی کے خیال میں اس کتاب کا علمی معیار ان کتابوں سے کہیں بلند تر ہے جن کے لئے اس کی معلومات کے مطابق یورپ یا ہندوستان میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کے ایک باب کی مزید توسیع کر کے ایک اور کتاب لکھی جس کا نام "تعلیم کے ابتدائی اصول" (FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION) ہے اس کتاب میں انہوں نے مغرب کے عظیم تعلیمی فلسفیوں مثلاً ڈیوی، سر پرسی نن اور جیمز راس کے تعلیمی نظریات کی تردید کی اور اس کے ساتھ ہی اسلام کا ایک مثبت تعلیمی فلسفہ بھی پیش کیا۔ اس کتاب پر ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ کی ڈی لٹ کی ڈگری ملی تھی جو سب سے اونچی ڈگری سمجھی جاتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی بنیادی کتاب "مستقبل کا نظریہ حیات" مغرب کے نظریات کا موثر علمی جواب ہے اور آئندہ ماضی اور مستقبل کے باطل نظریات کی تردید میں جو شخص بھی کچھ لکھنے کی کوشش کرے گا وہ اس کتاب کی قائم کی ہوئی بنیادوں کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ لہذا ہر ممکن طریق سے ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کی عالمگیر اشاعت کرنا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمیں اس کتاب کا اردو ترجمہ کروانے اور اسے بالاقساط "میثاق" کے پرچوں میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب اس ترجمے کی نگرانی براہ راست خود کر رہے ہیں لہذا ہمیں یقین ہے کہ یہ ترجمہ مصنف کے مطالب اور مقاصد کے ساتھ پورا انصاف کرے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا انداز بیان سراسر فلسفیانہ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے قرآن اور حدیث کے حوالوں کے ساتھ اس کتاب کا ایک ڈیڑھ سو صفحہ کا اختصار بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے "منشور اسلام، یعنی اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریہ زندگی کی حیثیت سے جو آخر کار لازماً پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا"۔ اس چھوٹی کتاب کو بڑی کتاب کا تعارف یا دیباچہ سمجھنا چاہئے۔ لہذا ہم اپنے ترجمہ کا آغاز اسی چھوٹی کتاب سے کر رہے ہیں۔ صفحات آئندہ میں اس کی پہلی قسط حاضر خدمت ہے۔ ان شاء اللہ جب دونوں کتابوں کا ترجمہ شائع ہو جائے گا تو ان کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے گا۔ [اسرار احمد]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

منشور اسلام

یعنی اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریہ زندگی کی حیثیت سے جو آخر کار لازماً پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

یہ (کفار اور مشرکین) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کئے بغیر نہیں رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی بری کیوں نہ لگے۔ اللہ ہی تو وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت، اور دین حق (سچے نظریہ حیات) کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس دین حق کو تمام ادیان عالم پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکوں کو کتنی ہی ناخوشی کیوں نہ ہو۔

[سورۃ توبہ آیات ۳۲ و ۳۳]

تعارف

عالمی معاملات میں موجودہ بحران، جس کی وجہ سے تہذیب کی کامل بربادی کا ہی نہیں بلکہ نسلِ انسانی کی مکمل تباہی کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا ہے، نوعِ انسانی کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اس کا علاج دریافت کریں۔ حال ہی میں انہیں مذہب سے یکایک ازسرِ نو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ کیا اگر مذہب کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو وہی انسانوں کے لئے ان خطرات اور مصائب سے محفوظ رہنے کے لئے واحد پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے جو آج ان کے سروں پر منڈلا رہے ہیں؟

دوسری طرف مسلمان ساری دنیا کے سامنے علی الاعلان اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ صرف اسلام ہی وہ نظریۂ حیات ہے جو نسلِ انسانی کو مستقل اور مکمل طور پر متحد کر سکتا ہے، دنیا میں پائدار امن و امان قائم کر سکتا ہے اور انسان کو اس کے ذہنی، اخلاقی، مادّی اور روحانی ارتقاء کی اس انتہائی منزل تک پہنچا سکتا ہے جس تک پہنچنے کی صلاحیت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔

لہٰذا فطری طور پر مسلمانوں کے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟ اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق کیا ہے؟ اسلام کے دعاوی کی عقلی اور علمی بنیادیں کیا ہیں؟ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور وہ ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے کیا ذرائع اختیار کرتا ہے؟

"منشورِ اسلام" انہی سوالوں کے مختصر جوابات پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔

لفظ "مینی فیسٹو" (منشور) عموماً کسی بادشاہ یا مملکت یا منظم انسانی جماعت کی طرف سے کسی ایسے اعلان کے معنی میں مستعمل ہوتا رہا ہے جس کی رو سے عوام کو یہ بتانا مقصود ہو کہ ماضی میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے گئے ہیں اور آئندہ جن کارناموں کے انجام دینے کا اعلان کیا جا رہا ہے، ان کی تفصیلات اور وجوہات کیا ہیں؟ لیکن گذشتہ سو سال سے یعنی جب سے کمیونسٹ مینی فیسٹو، اشتراکیت کی عالمگیر تبلیغ کے آلۂ کار کی حیثیت سے شائع ہوا ہے (جس کے نتیجے کے طور پر یہ نظریۂ حیات اب فی الواقع دنیا میں ایک عظیم سیاسی طاقت کی شکل میں رونما ہو گیا ہے) اس لفظ کو یہ نیا مفہوم حاصل ہو گیا ہے کہ وہ ایک ایسے تحریری اعلان پر دلالت کرنے لگا ہے جو عالمگیر قبولیت کی تمنا رکھنے والے ایک نظریۂ حیات کی تاریخی بنیادوں، اساسی اصولوں اور متوقع کامیابیوں کی تشریح کرتا ہو۔ میں نے اس لفظ کو اسی موخر الذکر معنی میں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی تشریح کی حیثیت سے اس کا موضوع تاریخ کے ایک ایسے نظریہ کی صورت اختیار کرتا ہے جو فطرتِ انسانی کے ایک نقطۂ پر مبنی ہے

اور جس کی رو سے اسلام مستقبل کا وہ آخری اور عالمگیر نظریۂ حیات قرار پاتا ہے جو ناگزیر طور پر دنیا کے کنارہ تک چھپیل رہے گا۔ فطرتِ انسانی کے اس تصوّر کی مرکزی حقیقت یہ ہے کہ کسی نصب العین کی محبت کا جذبہ انسان کے تمام اعمال کی (حتیٰ کہ ان اعمال کی بھی جو بظاہر اس کی حیوانی جبلتوں کے منبع سے سرزد ہوتے ہیں) واحد، حقیقی اور بنیادی قوّتِ محرکہ ہے اور یہ جذبہ ایک ایسے نصب العین کی محبت سے ہی کامل اور مستقل طور پر مطمئن ہو سکتا ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو۔

یہ حقیقت مارکس کے بنیادی فلسفہ سے ہی متصادم نہیں ہوتی۔ بلکہ فرائڈ، ایڈلر اور میک ڈوگل کے ان نفسیاتی نظریات سے بھی متصادم ہوتی ہے جن کو عصرِ حاضر میں بالعموم فطرتِ انسانی کے معیاری اور صحیح نظریات سمجھا جاتا ہے۔ اگر منشورِ اسلام کے پڑھنے والے ان حقائق کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتے ہوں جو ان تمام نظریات کے بالمقابل اس حقیقت کی سچائی کو (اور اس سے اخذ کئے ہوئے دوسرے فلسفیانہ تصورات کی سچائی کو بھی جو اس منشور میں زیرِ بحث آئے ہیں) تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ میری انگریزی کتاب "مستقبل کا نظریۂ حیات" (IDEOLOGY OF THE FUTURE) ملاحظہ فرمائیں (شائع کردہ شیخ محمد اشرف تاجرِ کتب، کشمیری بازار لاہور)

محمد رفیع الدین

اسلام کیا ہے؟

اسلام کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اسلام اس نظریۂ حیات کا نام ہے جس کی تعلیم انبیاء کرام علیہم السلام ابتدائی زمانہ سے دیتے رہے ہیں۔ دنیا کے تمام خطوں میں بے شمار انبیاء وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں تاکہ نوعِ انسانی کے تمام حصوں کو ان کے زمانہ کے حالات، ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی ارتقاء کے مقامات کے مطابق اس نظریۂ حیات کی تعلیم دیں۔

وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ ۔ (۳۵-۲۴)

اور کوئی اُمّت (قوم) ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَیۡكَ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡكَ ۔ (۴۰-۷۸)

اور ہم نے تم سے پہلے (بہت سے) پیغمبر بھیجے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات تم سے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات بیان نہیں کئے۔

ان انبیاء کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے زیادہ کیا گیا ہے اور چونکہ ان سب کی دعوت بنیادی طور پر یکساں رہی ہے اس لئے ہر نبی نے اپنے پیش رو انبیاء کی صداقت کی گواہی دی ہے اور اپنے بعد آنے والے نبی کے ظہور کی

پیش گوئی کی ہے۔ بہر حال چونکہ حضرت محمد صلی اللہ کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کی مثال میں تمام انبیا کی دعوت کی نظری تلقین اور انسان کی فطرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر جن میں ان کی زندگی کے عمرانی، اقتصادی، سیاسی اور فوجی شعبے بھی شامل ہیں، اس کا عملی اطلاق دونوں اپنے کمال کو پہنچ گئے ہیں لہٰذا آپ بجا طور پر آخری الانبیاء قرار پائے ہیں اور اسلام کی اصطلاح بھی آپ ہی کی تعلیم بننے کے لئے جو قرآن اور سنت کے اندر موجود ہیں مخصوص ہو گئی ہے۔ چونکہ تمام انبیاء کی تعلیم بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی جو خدا کی ذات ہے ایک ہی ہے لہٰذا قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جو شخص گذشتہ انبیاء میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ سچا مسلمان نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

(متقی یعنی سچے مسلمان) وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔ (۴-۲)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶-۲)

(مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر اتری اس پر اور جو صحیفے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو کچھ اور پیغمبروں پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اس پر (ہم ان سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ) کے فرمانبردار ہیں۔

اسلام کی روح

اگر تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ لفظ "محبت" ہے۔ اسلام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ محبت کریں اور اپنی محبت کو جس قدر زیادہ پاکیزہ، مخلص، بے لوث اور صمیم قلب سے صادر ہونے والی بنا سکتے ہیں بنائیں اور پھر ان کی محبت ایسی ہو کہ وہ ہمیشہ عظیم سے عظیم تر کمال، پاکیزگی اور خلوص کی جانب بڑھتی رہے اور اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کمی، کمزوری یا مایوسی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

اسلام کی ضرورت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبوت کا ظہور درحقیقت کارخانۂ قدرت میں کسی مقصد کو پورا کرتا ہے؟ کیا انسان کو واقعی اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے کامل راستی اور مخلصانہ محبت کی تربیت اور ترقی کا وہ طریقہ سکھایا جائے جس کی تعلیم انبیاء دیتے چلے آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک کامل، پائدار اور مخلصانہ محبت ـــــ جو ایک نصب العین کے حصول کی والہانہ شکل اختیار کرتی ہے ـــــ انسان کی تمام فطری خواہشات میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور سب خواہشات پر غالب آنے والی خواہش ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خواہش چونکہ انسان کی تمام دوسری خواہشات کو اپنے تابع رکھتی ہے یوں کہنا چاہئے کہ وہ دراصل اس کی فطرت کی ایک ہی خواہش ہے اور انسان اسی خواہش سے عبارت ہے اور نبوت کی اہمیت یہ ہے کہ صرف وہی انسان کی اس خواہش کی صحیح، مکمل اور مستقل تشفی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا نبوت کا عالم فطرت میں ایک خاص مقصد ہی نہیں، بلکہ وہ کارخانۂ قدرت کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے ناگزیر ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰-۳۰)

پس اے پیغمبر! آپ دین (یعنی توحید اور اس کے متضمنات) پر یکسوئی سے قائم رہئیے یہ (دین) انسان کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت میں کوئی رد و بدل ممکن نہیں (لہٰذا) یہی دین پائدار ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔

انسانی فطرت کا تجزیہ۔ انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے۔ انسان کی نچلے درجہ کی خواہشات۔

فطرتِ انسانی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے ہیں۔ اوّل: وہ خواہشات جو بحیثیت حیوان، انسان کی فطرت سے صادر ہوتی ہیں اور جنہیں انسان کی جبلتی خواہشات کہا جاتا ہے۔ مثلاً خوراک کی خواہش، جنسی رابطہ کی خواہش، مخالف سے مقابلہ کرنے اور راستہ سے ہٹانے کی خواہش۔ ان جبلتی خواہشات کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(و) یہ خواہشات انسان اور ان حیوانات میں مشترک ہیں جو درجۂ ارتقا میں اس سے فروتر ہیں۔ مثلاً گائے، گھوڑا، اونٹ وغیرہ۔

(ب) ان خواہشات میں ایک داخلی حیاتیاتی دباؤ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے حیوان ان کی تسکین کی جستجو پر مجبور ہوتا ہے۔

(ج) ان خواہشات کی تسکین سے ایک خاص قسم کی مسرت یا آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

(د) ان کی تسکین حیوان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی صحت اور اپنی جسمانی نشو و نما کو برقرار اور اپنی زندگی اور نسل کو محفوظ رکھے۔

انسان کی بلند تر درجہ کی خواہشات

دوئم: وہ خواہشات جو بحیثیت انسان، اس کی فطرت سے سرزد ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے :-

(ا) نصب العین کی خواہش۔

(ب) اخلاق عمل کی خواہش۔

(ج) حصول علم کی خواہش۔

(د) فنی تخلیق کی خواہش۔

ان خواہشات کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

(ا) یہ خواہشات انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں دوسرے حیوانات اس کے ساتھ شریک نہیں۔

حیوان اور انسان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک حیوان صرف جانتا ہے، محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے۔ لیکن ایک انسان صرف جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہی نہیں بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جان رہا ہے، محسوس کر رہا ہے اور سوچ رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک حیوان صرف ذی شعور ہوتا ہے مگر ایک انسان خود شعور بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے حیوان اور انسان کی فطرتوں میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ وہ خواہشات جو انسان سے خاص ہیں اس کی خود شعوری یا خودی کی خواہشات ہیں۔

(ب) ان خواہشات سے کوئی حیاتیاتی اضطرار وابستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ وہ آزاد خواہشات ہیں جو فقط زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تشفی کا راستہ جبلتوں کی طرح حیاتیاتی اعتبار سے معین نہیں ہوتا۔

(ج) ان میں سے ہر خواہش کی تشفی سے ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے جو اپنی بہترین اور بلند ترین حالت میں اپنی کیفیت اور شدت کے لحاظ سے اس مسرت سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جو انسان کو جبلتی خواہشات

کی تشفی سے حاصل ہوتی ہے۔

(د) جب یہ اپنی بہترین اور بلند ترین صورت میں ہوں تو ان کی تشفی خود ان کی تشفی کی خاطر ہی عمل میں لائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور محرک یا مقصود نہیں ہوتا۔

(ہ) ان کا مقصد حسن کی جستجو ہوتا ہے۔ مثلاً نصب العین کی محبت ہی کو لیجئے۔ نصب العین ایک ایسا تصور ہوتا ہے جس کی طرف انسان وہ سارا حسن منسوب کرتا ہے جو اس کے خیال میں آسکتا ہے اسی طرح سے اخلاق عمل یا نیکی حسن کے عملی اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور علم کی خواہش درحقیقت صداقت یا سچائی کی خواہش ہے اور صداقت ایک ایسی چیز ہے جسے ہم سراہتے اور پسند کرتے ہیں یعنی جس کی طرف ہم حسن کو منسوب کرتے ہیں۔ اور فن یا آرٹ کسی واسطے کے ذریعہ سے حسن کے اظہار ہی کا نام ہے۔

آرٹ کی ایک عام قسم

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فن یا آرٹ اینٹ، پتھر، آواز، صدا، رنگ، لفظ یا حرکت میں حسن کا اظہار ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ ایک ایسا مشغلہ سمجھ لیا گیا ہے جس میں صرف وہ چند افراد ہی حصہ لے سکتے ہیں جنہوں نے اس غرض کے لئے خاص طور پر تربیت حاصل کی ہو یا جن کو اس مشغلہ کے لئے قدرت کی طرف سے ایک خاص ملکہ عطا ہوا ہو۔ لیکن آرٹ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں تمام انسان مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں اور وہ طرز بود و باش میں حسن کا اظہار ہے۔ مثلاً جب ہم اپنے مکان کے بنانے اور سجانے میں اپنے لباس میں، اپنی رفتار و گفتار میں، کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں، اپنے مادی ماحول کی تخلیق میں اور اپنے تمام کاموں میں ظاہری طور پر حسن کا اظہار کرتے ہیں تو ہم ایک قسم کے آرٹ میں حصہ لے رہے ہوتے ہیں۔

نصب العین کی خواہش انسان کی تمام دوسری خواہشات پر حکمران ہوتی ہے

نصب العین کی خواہش انسان کی ان تمام خواہشات پر حکومت کرتی ہے جو اس کی زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا ذکر مندرجہ بالا کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ان خواہشات میں سے کوئی اپنی اصل حالت میں اس بڑی خواہش کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو تو وہ اس کو بدل کر ان تقاضوں کے مطابق کر لیتی ہے۔ اوپر عرض کیا گیا تھا کہ اپنی اصل حالت میں ان خواہشات میں سے ہر خواہش صرف اپنی ہی تشفی چاہتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد مثلاً کسی دوسری خواہش کی خدمت یا اعانت نہیں ہوتا۔ لیکن جب نصب العین پوری طرح سے حسین نہ ہو تو پھر

ان میں سے کوئی خواہش بھی اپنی اصلی حالت میں اس کے مطابق نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں نصب العین کی خواہش ان میں سے ہر ایک کو بدل کر اپنے مطابق کر لیتی ہے اور یہ تبدیلی غیر شعوری طور پر عمل میں آتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ اس نے ان خواہشات کو اپنے اصلی راستہ سے ہٹا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نصب العین کے جانچنے والوں کا ضابطہ اخلاق و علم اور آرٹ الگ ہوتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی یا حیاتیاتی سطح کی خواہشات پر کیوں حکمران ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان وہ سارا حسن جس کی تمنا اس کی فطرت کے ایک تقاضا کے طور پر اس کے دل میں ہوتی ہے اپنے نصب العین کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ دیکھے کہ اس کی کوئی خواہش اس حسن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تو جب تک وہ اس کو بدل کر اس حسن کے مطابق نہ کرے وہ اسے نہ جویائے حسن سمجھ سکتا ہے اور نہ درست۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی اور حیاتیاتی خواہشات پر ہی نہیں بلکہ اس کی جبلتی خواہشات پر بھی حکمران ہے۔ ایک حیوان کے لئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی جبلتی خواہش کے دباؤ کو روک سکے۔ اس کے برعکس انسان اپنی کسی جبلتی خواہش کی تشفی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نصب العین اجازت نہ دے اور وہ اپنی ہر جبلتی خواہش کی تشفی صرف اسی حد تک کرتا ہے جس حد تک اس کا نصب العین اجازت دیتا ہو۔ جب ایک انسان کا نصب العین یہ تقاضا کرتا ہو کہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھے، تو وہ اس کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جبلتی خواہشات کی مناسب تشفی کے لئے پوری کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب نصب العین کا تقاضا یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی کو اس کی حفاظت کے لئے قربان کر کے شہید ہو جائے تو وہ جبلتی خواہشات کی تشفی سے ہی نہیں بلکہ خود زندگی سے بے پروا ہو جاتا ہے اور اسے قربان کرنے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو ان لاتعداد واقعات کی تشریح کرتی ہے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے نصب العین کی خاطر یہ جانتے ہوئے زندان میں جانا قبول کر لیا ہے کہ وہاں اسے اپنی جبلتی ضروریات کو روکنا یا ترک کرنا پڑے گا یا اُسے سخت قسم کی بدنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا یا فلاں شخص نے نصب العین کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے یا دار پر چڑھنا یا میدان جنگ میں گولی کھا کر مر جانا قبول کر لیا ہے۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان بالآخر اور درحقیقت صرف ایک ہی خواہش رکھتا ہے اور وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تمام نفسیاتی یا جبلتی خواہشات اس ایک خواہش کے تابع اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ یہی ایک خواہش اس کے تمام اعمال و افعال کی اصلی اور بنیادی قوت محرکہ ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی کوئی اور قوت اس کے کسی عمل یا فعل کو پیدا نہیں کرتی۔ یہی خواہش فطرت انسانی کا وہ طاقتور اور زبردست جذبہ عمل ہے جس کو فرائڈ نے غلطی سے جنسی محبت کا جذبہ سمجھا ہے۔ جسے ایڈلر نے نادانی سے قوت یا غلبہ

حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ہے۔ جس پر میکڈوگل کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ انسان کی جبلتی یا حیوانی خواہشات کے ایک پیچ اسرار مرکب کا جذبہ ہے اور جسے کارل مارکس نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بقیہ: **تعارف کتب** (بقیہ صفحہ ۷۸)

حق سے انکار نے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہوگی۔ کتاب کو دیکھ کر اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ موصوف بلا شبہ سیاسیات کے مرتبہ مجتہد اعظم پر فائز ہیں" (صفحہ ۱۸) جو لوگ اس معاملے میں مودودی صاحب کی کج فہمی و غلط فہمی سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی ؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے ؟
- قیام پاکستان کے بعد اس نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریک جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ ——— تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد۔ ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبۂ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

ضخامت ۲۳۴ صفحات ۔ سائز بڑا ۔ طباعت آفسٹ ۔ مجلد مع گردپوش قیمت ۴/۵۰ روپے۔ علاوہ محصولڈاک

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ کوثر روڈ۔ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ ۱

ہم سے طلب فرمائیے

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر ترین لیکن جامع ترین کتاب

النبی الخاتمؐ

تالیف: مولانا سید مناظر احسن گیلانی

۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۸۰ کاغذ سفید قیمت -/۳ روپے

حقیقت خلافت و ملوکیت

تالیف: علامہ سید محمود احمد عباسی

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیف

'خلافت و ملوکیت' کا مسکت جواب

مستند تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

سائز ۲۲×۲۹/۱۶ صفحات ۵۶۸ مجلد

قیمت قسم اوّل سفید کاغذ مع ڈسٹ کور: ۰۰-۱۱ روپے

" قسم دوم نیوز پرنٹ: ۷۵-۶ "

انوارِ مجدّدی

یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشی مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۸۴ مجلد مع ڈسٹ کور

قیمت چار روپے صرف

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

حیاتِ اقبالؒ

ایک اجمالی خاکہ

[پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقیدِ حیات ہی تھے، پروفیسر صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانحِ حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لئے اوّلاً ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لئے خود لکھی تھی اور ثانیاً 'پیغامِ اقبال' کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر 'مثنوی اسرار و رموز' کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا ——— پروفیسر صاحب کی ان گمشدہ تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آ گئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرما دی۔ اور اس طرح اب قارئین 'میثاق' کی خدمت میں پیش ہے۔

اس تحریر کا اصل حصّہ جو علامہ مرحوم کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اس پیغام پر مشتمل ہے جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ کو دیا ہے وہ تو آئندہ شائع ہوگا۔ اس ماہ حیات و سیرتِ اقبالؒ کا اجمالی خاکہ پیشِ خدمت ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں۔ تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدرے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بگوش اور عقیدت مند کے قلم سے نکلی تھی اور انشاء اللہ قارئین 'میثاق' میں سے وہ حضرات بھی اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جو علامہ مرحوم کے حالاتِ زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ خود علامہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد، اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکرین پر جو نوٹ لکھا ہے

مضمون میں آ گئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور ان سے اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں مستحضر رکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ بہت سی باتیں جو اس مضمون میں بصیغۂ حال بیان ہوئی ہیں کب کی قصّۂ ماضی بن چکیں۔ چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے ——— اس میں بھی ایک خزانۂ عبرت پنہاں ہے کہ

"جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!"

[اسرار احمد]

سوانح حیات

علامۃ العصر ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال مدظلہٗ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ جن کی گوت "سپرو" تھی۔ وہ ایک باکمال ولی اللہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے اور اس ولی کا روحانی تصرف آج تک ان کے خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسنِ عقیدت جس نے سپرو کو شیخ بنا دیا، ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسی لئے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں۔ مثلاً:

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ   بتے می تراشد ز سنگ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۸ء (یا ۱۸۷۷ء) میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ والدین نے اقبال نام رکھا۔[۱] میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہوگا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحبِ اقبال ہوگا اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا، جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔

ابتداءً مکتب میں داخل ہوئے اس کے بعد سکول میں نام لکھایا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کر کے مقامی دوسرے کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحبؒ[۱] کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاد

[۱] فقیر راقم الحروف نے دوران قیام سیالکوٹ میں علامہ موصوف کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کیا تھا۔ تقریبِ ملاقات یوں ہوئی کہ میں نے ایک دن اپنے مکرم و محترم مولوی احمد دین صاحب مرحوم (والد بزرگوار حضرت اثر صہبائی مرحوم) سے عرض کی کہ میں والد علامہ اقبال، مولانا میر حسن اور علامہ عبدالحکیم مرحوم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ فرمانے لگے میرے ساتھ چلو ان سب سے ملا دوں گا۔ چنانچہ ان کی معیت میں علامہ موصوف کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتوار کے دن، کوئی گیارہ کا عمل ہوگا، ہم دونوں پیدل روانہ ہو کر اس بزرگ کی خدمت میں جا پہنچے۔ شیخ صاحب موصوف کی عمر دسمبر ۱۹۲۳ء میں اسی اور نوے کے درمیان ہوگی۔ صحت بہر حال کم نہ تھی۔ بصارت اور سماعت دونوں میں فرق آ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے مجھے متعارف کیا۔ میں نے کہا مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج میں نے اس شخص کو دیکھا، جس کے گھر اقبال جیسا بیٹا پیدا ہوا۔ جس نے ارسطو اور افلاطون کی صف میں اپنے لئے جگہ بنائی ہے جو فلسفۂ مغرب کا ماہر ہونے کے باوجود بھی آقا کا شیدائی ہے جس کے زورِ کلام اور رفعتِ تخیل نے مشرق اور مغرب دونوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے ......"

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

فرمانے لگے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ "ذٰلک فضل اللہ الخ" پھر مجھے حقہ دیا میں نے ان کی خاطر سے دو چار کش لگائے۔ مولوی صاحب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نہایت ذہین اور طباع انسان تھے۔ جوانی میں ان کی دکان سیالکوٹ کے شرفا اور زندہ دل لوگوں کا مرکز تھی۔ وہ سرسید رح کے بڑے حامی تھے اور اگرچہ تعلیم برائے نام تھی لیکن علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی حاجی یا عالم (؟) سواد انسان ہے۔ صورت سے ڈاکٹر اقبال سے بہت ملتی تھی۔ رنگ جوانی میں شباب ہوگا اس عمر میں بھی رخساروں پر سرخی باقی تھی۔ معلومات عامہ کا چسکا پڑا ہوا اب چھوٹتا ہے۔ دوسروں سے اخبار پڑھوا کر سنتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

[۱] میں نے مولانا کو دسمبر ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً نوّے سال کی ہوگی۔ بصارت سے محروم ہو چکے تھے لیکن بصیرت کافی حاصل تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی جوانوں کو درس عبرت دیتی تھی۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اردو، فارسی اور عربی کے نوک زبان تھے۔ میں نے نظیری کا ایک شعر پڑھا اور اس کے معانی دریافت کئے۔ فرمایا آپ تو ماشاء اللہ فارسی میں خاصی لیاقت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں نے عرض کی کہ مقصود یہ ہے کہ شاگردی کا شرف حاصل ہو جائے۔ آپ اقبال کے استاد ہیں جن کی شاگردی کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ پس اگر آپ سے یہ نسبت حاصل ہو جائے تو مجھ کو مباہات کا ایک پہلو بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ جائے گا اور میں ہم چشموں میں یہ کہہ سکوں گا۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ   ذرۂ آفتاب تابانیم

میری گفتگو سے قدرے محظوظ ہوئے اور فرمانے لگے میاں ہمیں بھی استادوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا چسکا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں یہی شوق کشاں کشاں غالب کی خدمت میں دلی لے گیا تھا۔ اس وقت سیالکوٹ میں ریل نہیں آئی تھی اس لئے وطن سے دہلی تک گھوڑے پر سفر کیا تھا۔ بعض موقعوں پر پیدل بھی چلنا پڑا۔ مگر شوق نے ساری منزلیں طے کرا دیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا۔ فیضِ صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت شدہ تھا۔ لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

باقاعدہ شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام النادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علامہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چشموں میں معروف اور ممتاز رہے۔

اسی سال آپ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے۔ دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔

جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن تھے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دور میں ڈاکٹر آرنلڈ[1] کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو مدۃ العمر باقی رہا۔ آرنلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسر آجائے، وہ

حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ

مولانا کی دینداری اور علمیت کا حال بیان کر چکا۔ ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں۔ جوانی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا جب تک پیدل چلنے کی طاقت باقی رہی روزانہ بلا ناغہ اپنی والدہ کی قبر پر جاتے رہے۔ ایک سیپارہ جاتے اور ایک آتے ختم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۵۶ سال تک جاری رہا۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

[1] ڈاکٹر سر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ، سی آئی ای، ڈی لٹ، ایم اے، ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے تھے۔ عجیب علم دوست اور ذہین و فطین اور بالغ نظر انسان تھا۔ عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی اور راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں سے نفرت نہیں تھی۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ دعوتِ اسلام جس کا ترجمہ سر سید کے ایما سے شیخ عنایت اللہ خلف شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ دہلوی نے کیا تھا ایسی کتاب ہے جو دراصل ہمارے علماء کو لکھنی چاہیے تھی لیکن بقول علامہ شبلیؒ وہ ہمارے علماء اس سے کہیں زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں، مثلاً تکفیر اہل قبلہ، مسئلہ امتناع نظیر، مسئلہ امکان کذب، استنجا بالمدر او بالماء، حقیقتِ غراب، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، قیام در میلاد، صلوٰۃ قبل المنبر، جوازِ شیئاً للہ، انہدامِ قباب، تقبیل الابہامین، استمداد عن القبور، احضار صورتِ محمدی، ایصالِ ثواب وغیرہ۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

رفتہ رفتہ محقق بن جاتا ہے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اور زیادتی ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے[1]۔ کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آگئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

اس کتاب سے ان کے تبحر علمی، وسعتِ معلومات اور اعلیٰ قابلیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

غالباً ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور آئے۔ یہاں انہوں نے تفسیر کبیر کے اقتباسات سے معتزلہ کے عقائد پر ایک رسالہ عربی زبان میں تالیف کیا تھا جو لیوزک (LUZAC) نے لندن سے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے یہ رسالہ ۱۹۲۵ء میں پڑھا تھا۔ چونکہ علم دوست تھے اس لئے انہیں علامہ اقبال سے خاص انسیت ہو گئی تھی اور علامہ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک نظم بھی ان کی یاد میں لکھی ہے جس کا عنوان ہے "نالۂ فراق"

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں ۔۔۔ آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

پوری نظم بانگِ درا صفحہ ۷۸ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی آخری تصنیف (ISLAMIC FAITH) ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی اس کتابچہ میں انہوں نے اپنے شاگرد (اقبال) کی خدمت میں بھی خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

[1] راستہ میں دہلی میں قیام کیا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار پر بکمال حسنِ عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے اور کامیابی کے لئے دعا کی۔ یہ دعا ایک نظم کی صورت میں آج بھی باصرہ نوازی اور بصیرت افروزی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے اور بانگِ درا کے صفحہ ۵۰ پر مندرج ہے۔ پہلے بند میں توصیف ہے اس کے بعد التجا ہے:

چلا ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے ۔۔۔ شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں ۔۔۔ کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھ کو

فی الجملہ تمام نظم جذبات عالیہ سے معمور ہے۔ ناظرین کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس نظم میں یہ شعر بھی تھا

کھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا ۔۔۔ ملا ہے جن کے کرم سے یہ آستاں مجھ کو

مگر مطبوعہ نظم میں یہ شعر درج نہیں ہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد، ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ شام کی گاڑی سے لاہور واپس آئے۔

دورانِ قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علما اور فضلا کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ[1]، ڈاکٹر براؤن[2]، ڈاکٹر نکلسن[3] اور ڈاکٹر سارلے[4] خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ پہلے انارکلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصے سے میکلوڈ روڈ پر قیام ہے[5]۔ اقبال کی وجہ سے مجھے اس سڑک سے وہی وابستگی ہے۔ جو مجنوں کو کوچۂ لیلیٰ سے تھی۔

۱۹۳۴ء میں جاوید منزل —————— ۱۹۳۸ء میں وفات

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پریکٹس کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس پیشے سے کوئی خاص دلچسپی

---

[1] (DR. METAGGART) (۱۸۶۵ء/۱۹۲۳ء) کیمبرج میں فلسفہ کا پروفیسر تھا اس کے فلسفیانہ نظام کا اصطلاحی نام (ONTOLOGICAL IDEALISM) ہے اس کی فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ چونکہ خودی (EGO) قائم بالذات اور ازلی ہے اس لئے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جین دھرم کا بنیادی عقیدہ یہی ہے۔

[2] (DR. E. BROWN) تاریخ ادبیات ایران چار جلد کے شہرۂ آفاق مؤلف فارسی اور عربی کے بے نظیر محقق، نہایت شریف اور نیک نفس انسان۔ جس نے صدہا نوجوانوں کو سکالر اور ڈاکٹر اور نقاد بنا دیا کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ کثیر نادر الوجود فارسی مخطوطات ان کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ بابی اور بہائی مذہب کے متعلق ان کی معلومات لائق رشک تھیں۔

[3] (DR. R. A. NICHOLSON) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ بقید حیات ہیں۔ مؤلف تاریخ ادبیات عرب۔ شعبہ تصوف سے خاص دلچسپی ہے۔ کئی کتابیں اس موضوع پر تالیف کی ہیں زاویہ نگاہ تنگ اور غیر ہمدردانہ ہے۔ اسرار خودی کا ترجمہ (SECRETS OF THE SELF) کے نام سے شائع کرکے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے۔

[4] (DR. SORLEY) کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاق کے پروفیسر ہیں۔ عمر غالباً ۸۵ سال ہوگی۔ ان کی مشہور تصنیف (MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD) ہے ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو کیمبرج مدعو کیا تھا۔

[5] ۱۹۳۵ء میں میو روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

کبھی نہیں ہوتی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل و دماغ، فلسفیانہ مزاج صوفیانہ افتادِ طبع اور عالمانہ طرز زندگی رکھتا ہو جو (VISIONARY IDEALIST) ہو۔ جس کی توجہ تمام تر ملت اسلامیہ کی بہبود پر مبذول رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بیشتر سا وقت EGO اور REALITY کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرارِ خودی کا مصنف ہو اُسے "نظائرِ دیوانی" اور "اسنادِ فوجداری" سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے؟

۱۹۲۳ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی خطابات یا اعزازات کے لئے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا میں رہتے ہیں جہاں SIR اور SERVANT دونوں یکساں نظر آتے ہیں ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

(بقیہ حاشیہ) ۱۹۲۶ء میں آپ اپنے عقیدت مندوں کے اصرار سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے آمادہ ہوئے عموماً امیدوار ہزارہا روپیہ خرچ کرتے ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ ووٹر کی خوشامد وظیفۂ حیات بن جاتی ہے۔ لیکن اہل لاہور جانتے ہیں کہ اقبال بغیر "منتِ مخلوق" کامیاب ہوا تھا۔

کونسل میں آپ نے برابر تین سال تک ملک اور قوم کی گراں بہا خدمات انجام دیں جن کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیئے جو ۱۹۳۰ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔ وہاں سے آپ میسور، بنگلور ہوتے ہوئے حیدرآباد دکن آئے۔ یہاں کی علمی مجلسوں کو نوازا۔ اور طالبانِ علم کی پیاس بجھائی۔

دسمبر ۱۹۳۰ء سرکار برطانیہ نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کرکے لندن بھیجا۔ (۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو محمد علی کا انتقال ہوا)

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تیسری کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔

ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں لندن میں (ARISTOTELIAN SOCIETY) کے سالانہ جلسہ میں ایک معرکۃ الآرا مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے "IS RELIGION POSSIBLE?" اسی سفر میں آپ نے اسپین کا بھی دورہ کیا اور عربوں کی عظمتِ رفتہ کے آثار غرناطہ اور قرطبہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ فروری یا مارچ ۱۹۳۳ء میں واپس آئے۔

(واضح ہو کہ یہ مضمون ۱۹۳۳ء میں لکھا تھا اس لئے یہیں ختم ہو گیا۔)

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر، ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ء سے سمجھنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف احباب اور کالج کے طلبہ تک محدود تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا۔

غالباً دوستوں نے مشورہ دیا ہوگا کہ آپ کو کسی باکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیئے کیونکہ استاد بہرحال، خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہوگا۔ بہرکیف آپ نے بلبل ہند نواب فصیح الملک بہادر، مرزا داغ دہلوی، استاد اعلیٰ حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کر لیجئے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لئے بھیجیں۔

تلمذ کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ ہاں بقول "دیباچہ" جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ "اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی" "اقبال کی خوش نصیبی کہ اسے داغ جیسا زباندان اور کامل الفن استاد ملا، اور داغ کی بلند بختی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔"

اقبال نے خود بھی ایک غزل کے مقطع میں، داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پہ نہیں نازاں — مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

سب سے پہلے لاہور میں، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے:۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض — ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو شعراء قوموں کو زمزمہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زمانی دونوں قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز وہی کر لی جو ان کے لئے مناسب تھی۔ یعنی ۱۹۱۱ء سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہو گئی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ نے "خونِ شہیداں کی نذر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کر دی۔ جس وقت آپ نے یہ شعر پڑھا

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا۔ "آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔" والا مضمون ہے ہر آئینہ نظم سوز دروں کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی سیرت

علامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا شرف حاصل ہو چکا ہے[1]۔ اس لئے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی عدیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس، سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو غرضکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں (PLAIN LIVING AND HIGH THINKING)

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کا در فیض ہر کس و ناکس کے لئے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نوابوں اور خان بہادروں کو آسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک "اسلام علیکم" کہہ کر خواجۂ علم و فضل کی ذرہ نوازی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں۔ "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاگنڈا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملت اسلامیہ کی بہبود کی تدابیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ سچ ہے:

شہرت شورش گیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکار دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیفیت ہوتا ہے، سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوز عشق مصطفےٰ صلعم سے مالا مال ہیں اسی لئے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حب رسولؐ کے لئے نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ چاہیئے نہ طویل اللحیۃ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف درد آشنا دل درکار ہے[2]۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لئے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ کی پرستش کرتا۔ انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذبات محبت کی قدرے ترجمانی کرتا ہے۔

[1] پہلی ملاقات جنوری ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔
[2] یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے اب ۱۹۶۹ء میں میری رائے بدل چکی ہے۔

علامہ کی تصنیفات

(۱) علم الاقتصاد	اردو	نایاب ہے
(۲) فلسفۂ ایران	انگریزی	مل سکتی ہے
(۳) اسرار خودی	فارسی	" " "
(۴) رموز بے خودی	"	" " "
(۵) پیام مشرق	فارسی	مل سکتی ہے
(۶) زبور عجم	"	" " "
(۷) لیکچرز مدراس	انگریزی	" " "
(۸) جاوید نامہ	فارسی	" " "
(۹) بانگ درا	اردو	" " "
(۱۰) بال جبریل	"	" " "
(۱۱) ضرب کلیم	"	" " "
(۱۲) مسافر	فارسی	" " "
(۱۳) "پس چہ باید کرد"	"	" " "
(۱۴) ارمغان حجاز	فارسی و اردو	" " "

قدر دانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء، حکماء، فلاسفہ کی قدر ان کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال کی شہرت ان کی زندگی ہی میں کافی ہو چکی ہے۔

(۱) ترکی زبان میں عربی زبان میں اور انگریزی زبان میں ان کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن نے اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ کئی جرمن علماء نے علامہ کے کلام اور فلسفہ پر تبصرہ جرمن زبان میں شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں میں، ان کے فلسفہ پر محققانہ مضامین لکھے گئے ہیں۔

"تاریخ تصوّفِ اسلامی"

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

حضرت ابوسعید خرّازؒ

(م ۔ ۲۸۶ھ)

صاحب "کتاب الصدق"

حضرت ابوسعید احمد ابن عیسیٰ الخرّاز کا شمار تیسری صدی ہجری کے نامور صوفیوں میں ہے۔ افسوس ہے کہ ہمیں ان کی زندگی کے بہت کم حالات معلوم ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے حسب معمول بہت سی کرامات ان سے منسوب کی ہیں مگر ان میں سے کوئی کرامت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی اس لئے ہم ان کے اندراج سے معذور ہیں۔ اگرچہ ان کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے لیکن ظن غالب یہی ہے کہ انہوں نے ۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ خرّازؒ کا ہے گاہے ذوالنون مصریؒ، بشر ابن حارثؒ، سری سقطیؒ اور النباجیؒ سے ملتے رہتے تھے اور یہ سب حضرات ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

ممکن ہے انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہوں مگر اب تک صرف "کتاب الصدق" منصہ شہود پر آئی ہے۔ اور حارث المحاسبیؒ کی "کتاب الرعایۃ لحقوق اللہ" کے بعد یہ تصوّف کی قدیم ترین کتاب ہے۔ جو مطبوعہ صورت میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

مولانا جامیؒ نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ خراز کا نام احمد ابن عیسیٰ ہے۔ خرّاز لقب ہے۔ وطن بغداد تھا۔ کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی مجاورت کی اور ۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

شیخ فریدالدین عطارؒ نے "تذکرۃ الاولیاء" میں ان کے جو حالات درج کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خرّاز کا لقب "لسان الصدق" تھا۔ طریقت میں اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ ان سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ میں نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے اور پوچھا کہ صدق کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ "الوفا بالعہود" یعنی وعدہ پورا کرنا۔ انہوں نے کہا صَدَقْتَ یعنی تو نے سچ کہا اس کے بعد وہ آسمان پر چلے گئے۔ نیز انہی سے روایت

ہے کہ جب میں دمشق میں تھا تو ایک رات آنحضرت صلعم کو خواب میں دیکھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے درمیان ان کا سہارا لے کر تشریف لا رہے ہیں۔ میں اس وقت ایک شعر پڑھ رہا تھا اور اپنی انگلی سینے پر مار رہا تھا حضور علیہ السلام نے فرمایا "اس کی برائی اس کی بھلائی سے زیادہ ہے یعنی سماع میں مشغول نہ ہونا چاہئے۔ خرازؒ کا قول ہے کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ اس سے دوستی کے باوجود آئندہ کے لئے ذخیرہ جمع کروں۔ نیز یہ کہ جب خدا کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اسے ذکر کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔ نیز یہ کہ جب بندے کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ دنیا میں اس کے سوا نہ کسی کو دیکھتا ہے نہ کسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ حقیقی علم وہ ہے جو تجھے عمل پر راغب کر سکے اور یقین یہ ہے کہ تو سب سے بے نیاز ہو جائے۔ (ماخوذ از تذکرۃ الاولیاء)

کتاب الصدق کا تعارف

شیخؒ نے اپنی کتاب کا آغاز سوال و جواب کی صورت میں کیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ سوال کیا ہے کہ صدق کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ صدق وہ لفظ ہے جو تمام معانی پر حاوی ہے۔ اس کے بعد پہلے مختصر طور پر وضاحت کی ہے پھر مفصل انداز میں تشریح کی ہے۔ اختصاراً یہ بتایا ہے کہ جو شخص نجات اخروی کا طالب ہو اسے سب سے پہلے تین اصولوں کی معرفت حاصل کرنی چاہئے۔

۱۔ پہلا اصول اخلاص ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ" نیز فرمایا "فادعوا اللہ مخلصین لہ الدین"

۲۔ دوسرا اصول صدق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ"

۳۔ تیسرا اصول صبر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ"

ان تینوں لفظوں کے معانی مختلف ہیں اور جمیع اعمال میں داخل ہیں۔ کوئی عمل ان تینوں کے بغیر کامل نہیں ہوتا اور خود یہ تینوں اصول باہم مگر اس طرح مربوط ہیں کہ کوئی ایک اصول دوسروں کے بغیر کامل نہیں ہوتا۔ مثلاً اخلاص بغیر صدق و صبر کامل نہیں ہو سکتا اور صبر بغیر اخلاص و صدق کامل نہیں ہو سکتا۔

اس مجمل جواب کے بعد صدق کی مفصل طور پر تشریح کی ہے چنانچہ اس کے لئے حسب ذیل فصول قائم کی ہیں:
صدق فی الاخلاص۔ صدق فی الصبر۔ صدق فی الانابۃ۔ صدق فی معرفۃ النفس۔ صدق فی معرفۃ ابلیس۔ صدق فی الورع۔ صدق فی الحلال الصافی۔ صدق فی الزہد۔ صدق فی التوکل۔ صدق فی الخوف من اللہ۔ صدق فی الحیاء۔ صدق فی معرفۃ نعم اللہ تعالیٰ والشکر لہ۔ صدق فی المحبۃ۔ صدق فی الرضا۔ صدق فی الشوق الی اللہ۔ صدق فی الانس بہٖ
شیخؒ نے ہر فصل میں اس امر کا التزام کیا ہے کہ سب سے پہلے اپنے دعوے کی تائید میں قرآن حکیم کی ایک یا

زیادہ آیات درج کی ہیں پھر ایک یا زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں اور ان کی روشنی میں اپنا دعویٰ ثابت کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی زندگی سے استشہاد کیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں حضراتؓ تمام صحابہؓ سے افضل ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف قرآن و حدیث اور اسوۂ صحابہ پر مبنی ہے۔

چونکہ طوالت کے خوف سے پوری کتاب نقل نہیں کی جا سکتی اس لئے ہم یہاں اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں جن سے قارئین کو پوری کتاب کی تعلیمات اور طرز نگارش کا اندازہ ہو جائے گا۔

الصدق فی الحلال الصافی

"پس ہر وہ قلب جو طاہر اور صافی ہے۔ آخرت کا آرزومند ہے۔ اور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے حال کا نگران ہے (اسے دیکھ رہا ہے) اسی لئے وہ ڈرتا رہتا ہے۔ مبادا وہ خفیہ طور پر (اپنے دل میں) املاک دنیوی کی ملکیت پر مطمئن ہو جائے اور اس طرح خدا سے غافل ہو جائے اور اسے علائق دنیوی میں لذت محسوس ہونے لگے۔۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے راہِ حق میں (جہاد کی تیاری کے لئے) مال طلب کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنا تمام مال و اسباب بلکہ پورا اثاث البیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا کر رکھ دیا اور جب سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا "مَا تَرَکْتَ لِعِیَالِکَ؟" (آپ نے اپنے عیال کے لئے کیا چھوڑا ہے؟) تو اس پیکر صدق و صفا اور عاشق روئے مصطفےٰ علیہ افضل التحیۃ والثناء نے کمال اطمینان قلب سے جواب میں عرض کی، "اَللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ[1] وَلَدیٰ عِنْدَ اللّٰہِ مَزِیْدٌ" یعنی اپنے عیال کی پرورش کے لئے اللہ اور رسولؐ کو چھوڑ آیا ہوں اور میرے لئے اللہ کے خزانے میں اس سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔

پس اس جواب سے ثابت ہوا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو اللہ تعالیٰ پر کامل اعتقاد تھا اور یہ اعتقاد کسی مادی شے میں نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ اشیائے مادی کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ وہ تو اس روحانی دولت پر مسرور اور مطمئن تھے جو اللہ کے پاس ہے جس کو کبھی زوال نہ ہوگا۔ انہوں نے مادیت سے قطع نظر کر لی اور یہ دیکھا کہ اس وقت میرا فرض کیا ہے؟ اور خلوص کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا۔ اور چونکہ اللہ پر کامل ایمان[2] اور اعتقاد تھا اس لئے اپنا سب کچھ لا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ڈال دیا اور اس طرح اللہ اور اس کے رسول کی نگاہوں میں وہ

[1] ان دو لفظوں میں حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے مومن کامل ہونے کا ثبوت مہیا کر دیا۔
[2] اسی لئے حضور انور فرماتے ہیں "اگر ساری امت کا ایمان ایک پلڑے میں اور ابوبکرؓ کا ایمان دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی بھاری رہے گا (مترجم)

مرتبہ حاصل کر لیا جو کسی صحابی کو نصیب نہ ہو سکا۔

ان کے بعد حضرت عمرؓ اپنا نصف اثاثہ لے کر آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی وہی بات دریافت فرمائی کہ اپنے عیال کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان کے لئے نصف مال چھوڑ کر آیا ہوں اور میرے لئے اللہ کے پاس بہت کچھ ہے۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ آئے اور جیش عسرۃ کو سامان جنگ سے لیس کر دینے کے لئے وعدہ کیا اور اس کے علاوہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اشرفیوں کا ڈھیر لگا دیا۔

ان حضرات کے اس طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں ان کے پاس جس قدر دولت تھی اس کا مالک اللہ تھا اور یہ حضرات اپنے آپ کو اس کا امین سمجھتے تھے۔ ان حضراتؓ نے مدت العمر اللہ کے احکام کے سامنے اپنی دولت سے دریغ نہیں کیا بلکہ مالک ہونے کے باوجود اپنی تمام دولت کو اللہ کی ملکیت سمجھا۔

یہی حضراتؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت ہدایت کے منصب پر فائز ہوئے۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور دنیا ان کے قدموں کے نیچے آگئی تو بھی انہوں نے اس کے حصول پر کسی فخر و مباہات کا اظہار نہیں کیا۔ وہ حکمران ہونے کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کا لباس صرف ایک چادر تھا جسے اوڑھ کر ببول کے دو کانٹے لگا لیا کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کا لقب "ذوالخلالین" پڑ گیا تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ عرب، عراق، ایران، مصر اور شام کے حکمران ہونے کے باوجود سالن کے بجائے روغن زیتون میں روٹی تر کر کے کھا لیا کرتے تھے ان کے کرتے میں بعض اوقات بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے اور یہ حالت اس حال میں تھی کہ قیصر اور کسریٰ کے خزانے ان کے قدموں میں تھے۔

یہی حال حضرت عثمانؓ کا تھا۔ آنجنابؓ وہی لباس پہنتے تھے جو ان کے غلام پہنتے تھے۔ ایک دن لوگوں نے انہیں دیکھا کہ وہ اپنے باغ سے لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے نفس کا امتحان کر رہا ہوں کہ وہ یہ مشقت برداشت کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں۔

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عامل تھے " اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ " (۵۷ - ۷) (ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اللہ نے جس دولت کا تمہیں وارث (مالک) بنایا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو۔ (پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ان کے لئے اجر کبیر ہے)

صدق فی الزہد

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور اسے ایسے ناموں سے یاد فرمایا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے اسے ایسے ناموں سے یاد نہیں کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ

وَالْاَوْلَادِ (۵۷ - ۲۰) جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت ہے اور آپس میں فخر کرنا ہے اور مال و اولاد میں ایک دوسرے پر کثرت چاہنا ہے۔

پس کیا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم رکھتا ہے اس بات سے شرمندہ نہیں ہوگا کہ اللہ اسے اس چیز سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیکھے جو اس دار الغرور (دھوکے کے گھر) میں محض کھیل تماشا ہے؟

عقلاء اور عرفاء بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا سے درحقیقت نفس اور اس کی خواہشات مراد ہیں اس کا ثبوت اس آیت سے مل سکتا ہے " زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ " (۳ - ۱۴)

لوگوں کو نفسانی خواہشات کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے ڈھیر اور پالتو گھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی۔ یہ سب صرف اس دنیا کی زندگی کا سامان ہے لیکن اللہ کے پاس اس سے بہتر ٹھکانا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مرغوبات دنیا کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا انسان کے لئے مفید نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھنا مفید ہے۔ یہ سب چیزیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا، نفس کی خواہشات اور لذت ہیں اور ان چیزوں کی وجہ سے نفس انسانی آخرت کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔ پس جب ایک شخص مرغوبات نفس کو ترک کر دیتا ہے تو گویا وہ دنیا کو ترک کر دیتا ہے۔

اس بات کو خوب سمجھ لو کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص غریب اور مفلس ہو اس کے باوجود وہ دنیا کا حریص ہو اور اس کی لذات کا طالب ہو لہٰذا اللہ کی نگاہ میں ایسا آدمی حریص ہے اور طالب دنیا ہے۔

زہد کا پہلا درجہ یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کی اتباع کو ترک کیا جائے۔ جب کسی انسان کی نگاہ میں اس کا نفس ذلیل ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ میرے پاس دولت ہے یا نہیں؟ وہ ہر حال میں اللہ کی رضا طلب کرتا ہے اور اسی میں اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بخوشی اپنے نفس کی مخالفت کرتا ہے اور اسے شہوت، لذت، سیر و تفریح دوستوں اور محبوبوں کی صحبت سے باز رکھتا ہے بلکہ ہر ایسے کام سے بچتا ہے جو اسے اللہ سے غافل کر دے۔

اس کے بعد وہ ان چیزوں پر قناعت کرتا ہے جو اس کی زندگی کے لئے اشد ضروری ہیں اور اپنی خواہشات کے دائرے کو محدود کر دیتا ہے۔ غذا، لباس، مکان، نیند، گفتگو وغیرہ میں محتاط ہو جاتا ہے۔ دنیاوی راحتوں اور نفس کی خواہشوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس بات کو مدنظر رکھتا ہے کہ مبادا یہ دنیا اس کی نگاہوں میں مرغوب

ہو جائے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "یہ دنیا بہت دل کش ہے" اسی لئے وہ ہمیشہ یاد رکھتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کی لذتیں سب فانی ہیں اسی لئے وہ اس سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی موت کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے اور آخرت کا آرزومند رہتا ہے جو ہمیشگی کا گھر ہے۔ وہ اس دنیا (حقیقی) کی نعمتوں کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ زہد کی پہلی منزل ہے۔

حضرات سفیان ثوریؒ، وکیع ابن الجراحؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور دوسرے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ زہد کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی امیدوں اور تمناؤں کو کم سے کم کر دے۔ اور علما نے بھی یہی کہا ہے کہ جب ایک آدمی اپنی امیدیں قلیل کر دیتا ہے تو غفلت کے دام سے رہا ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حضرت حارثہؓ سے دریافت کیا کہ آج تم نے کس حال میں صبح کی؟ انہوں نے جواب دیا "یا رسول اللہؐ! آج میں نے ایک سچے مومن کی حالت میں صبح کی" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے" انہوں نے جواب دیا یا رسول اللہ! میں نے اس دنیا سے قطع نظر کر لی ہے۔ میں نے دن میں بھوک پیاس برداشت کی (روزہ رکھا) رات کو قیام کیا (تہجد کی نماز پڑھی) میں نے قیام کے دوران میں ایسا محسوس کیا گویا عرش الٰہی میرے سامنے ہے اہل جنت خوشیاں منا رہے ہیں اور اہل دوزخ فریاد کر رہے ہیں!" یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ایسے مومن ہو جس کے دل کو اللہ نے منور کر دیا ہے۔ یہ حالت بہت مبارک ہے۔ تم نے ایمان کی حقیقت جان لی اس پر قائم رہو!"

ایک عالم دین کا قول ہے کہ زاہد وہ ہے جس کے دل سے دنیاوی چیزوں کی قدر و قیمت زائل ہو جائے واضح ہو کہ دنیاوی معاملات میں زہد ایک بہت نازک اور مختلف مسئلہ ہے۔ جس درجے میں کسی انسان کو معرفت الٰہیہ حاصل ہے اس کا زہد بھی اسی درجے کا ہو گا۔ اگر ایک شخص دنیاوی اشیاء کی محبت اپنے دل سے بتدریج کم کرتا ہے تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ زہد اسے کس مقام پر لے جائے گا۔ یا اگر ایک شخص خواہشات نفسانی کا مقابلہ کرنے میں کمزوری کا اظہار کرتا ہے تو دونوں صورتوں میں وہ زہد کے مقام پر فائز نہ ہو سکے گا اور اس کے دل میں آخرت کا شوق کبھی پیدا نہ ہو سکے گا۔

ایک عالم کا قول ہے کہ اصل زاہد وہ شخص ہے جس کی نگاہ میں یہ دنیا نہ نفرت کے لائق ہے نہ محبت کے۔ اور جب اسے مل جائے تو وہ خوش نہیں ہوتا اور جب چلی جائے تو رنجیدہ نہیں ہوتا۔ دوسرے عالم نے یہ کہا ہے کہ آدمی اس وقت زہد کے مقام پر پہنچتا ہے جب سونا اور پتھر دونوں اس کی نگاہ میں یکساں ہو جائیں اور ایسا نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی طرف سے کوئی آیت (نشانی) اس کے پاس نہ آ جائے۔ اس وقت اس میں

یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پتھر کو سونے میں اور سونے کو پتھر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس قوت کا ثمرہ یہ ہے کہ پھر صحیح معنی میں سونا اور پتھر دونوں اس کے لئے یکساں ہو جاتے ہیں اور سونے کی محبت اس کے دل سے نکل جاتی ہے۔

زہد کے مقاصد مختلف ہیں۔ بعض زاہدوں نے زاہد اس لئے اختیار کیا کہ وہ اپنے دل کو دنیاوی اشیاء کی محبت سے فارغ کر سکیں اور اللہ کی یاد میں مشغول ہو سکیں انہوں نے اپنے دل کو تمام مشاغل سے فارغ کر لیا تاکہ ایک مقصد پر اپنی توجہ مرکوز کر سکیں۔ یعنی اطاعت احکام الٰہیہ۔ پس اللہ ان کے لئے کافی ہو گیا۔ ابن ماجہ میں آنحضرت صلعم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جس نے اپنے تمام ہموم (افکار) کو ہم واحد (یعنی ایک ہی غم یا فکر) بنا لیا تو اس کے تمام امور کے لئے کافی ہو جائے گا" (من جعل الهموم هماً واحداً كفاه الله سائر همومه)

بعضوں نے زہد اس لئے اختیار کیا کہ اپنے بوجھ (علائق) کو ہلکا کر سکیں تاکہ منازل سلوک بآسانی طے کر سکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن وہ لوگ جو دنیا میں بڑے مرتبے والے ہیں، چھوٹے مرتبے والے کر دیئے جائیں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اپنی دولت اس دنیا میں اللہ کے بندوں میں تقسیم کر دی ہو گی" نیز آپؐ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر شخص جو اس دنیا میں امیر تھا، یہ آرزو کرے گا کہ کاش مجھے دنیا میں اسی قدر ملتا جو میری قوت لایموت کے لئے کافی ہوتا" حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے پاس کوہ احد کے برابر بھی سونا ہو تو میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ تہائی رات گزر جائے اور اس میں سے کچھ بھی میرے پاس باقی رہے" (بخاری، مسلم)

بعضوں نے اس لئے زہد اختیار کیا کہ وہ جنت کے مشتاق تھے اور نعمائے جنت کے تصور سے ان کو تسکین حاصل ہوتی تھی۔ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ زہد اختیار کریں گے تو میں ان کو جنت عطا کروں گا۔ نیز ایک عالم کا قول ہے کہ زہد کے بغیر قرأت میں کوئی خیر و خوبی نہیں۔

واضح ہو کہ زہد کے اعلیٰ مقامات ان لوگوں کو حاصل ہوتے جنہوں نے اللہ کی محبت میں اس کی رضا سے موافقت پیدا کر لی۔ یعنی اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں فنا کر دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو چکی تھی اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور اس کی سخت تحقیر کی ہے اور یہ کہا کہ یہ دنیا میرے دوستوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے انہیں اس بات سے شرم آتی تھی کہ اللہ انہیں دنیا کی طرف مائل پائے۔ انہوں نے دنیا سے قطع تعلق (تبتل) کو اپنے لئے فرض قرار دیا اور اللہ سے اس کا کوئی معاوضہ یا صلہ طلب نہیں کیا یعنی محض اس کی رضا کے لئے زہد اختیار کیا۔ انہوں نے خلوص کے ساتھ رضائے الٰہی سے موافقت کی اور اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

جو لوگ اللہ کی مرضی سے موافقت کرتے ہیں وہی درحقیقت سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔ حضرت ابو الدرداؓ سے روایت ہے کہ عقل مند لوگوں کا سونا اور جاگنا کس قدر مبارک ہے! جو لوگ غافل ہیں ان کے پہاڑ کے برابر اعمال کے مقابلے میں عقل مندوں کا ایک ذرّے کے برابر عمل اللہ کی نگاہ میں زیادہ وقیع اور قیمتی ہے۔

نقل ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ نے پینے کے لئے پانی طلب کیا۔ ایک شخص پیالے میں پانی لایا۔ جب انہوں نے ایک گھونٹ پی لیا تو پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور رونے لگے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا: "ایک دن میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ اپنے ہاتھ سے کسی چیز کو اپنے پاس سے ہٹا رہے ہیں مگر مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضورؐ کس چیز کو ہٹا رہے ہیں مگر مجھے وہ چیز نظر نہیں آتی۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "اس وقت دنیا بڑی دلفریب شکل میں میرے سامنے آئی تھی اور مجھ سے کہتی تھی کہ میں اس لئے آئی ہوں کہ آپؐ مجھے قبول فرما لیں۔ یہ سن کر میں نے کہا اے دنیا تو مجھے فریب نہیں دے سکتی۔ یہ کہہ کر میں نے اسے ہٹا دیا۔" یہ قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس وقت مجھے وہ بات یاد آگئی کیونکہ اس پانی میں قدرے شہد ملا ہوا ہے تاکہ مجھے لذت حاصل ہو۔ لہٰذا اس خیال سے مجھ پر گریہ طاری ہو گیا کہ مبادا میں دنیا کی طرف مائل ہو جاؤں۔"

احادیث میں وارد ہے کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو حصول لذت کے لئے کھاتے تھے اور نہ حصول مسرت کے لئے پہنتے تھے۔ نیز یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دنیاوی دولت اور حشمت صحابہؓ کے قبضے میں آئی اور قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے قدموں میں آن پڑے تو ان میں سے اکثر پر گریہ طاری ہو گیا وہ اکثر اوقات بہت رنجیدہ ہو کر کہتے تھے کہ ہم ڈرتے ہیں کہیں ہم دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ بعض اوقات وہ یہ کہہ کر آبدیدہ ہو جاتے تھے "کہیں ہمارے نیک اعمال کا بدلہ اس سلطنت اور دولت کی صورت میں ہمیں یہیں تو نہیں مل گیا؟"

لہٰذا انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرے اور ہر حال میں عدل کو ملحوظ رکھے۔ سلف صالحین کا نمونہ اپنے لئے مشعلِ ہدایت بنائے۔ ہر وقت اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتا رہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے نیکی اور راستی کی توفیق طلب کرتا رہے۔

> حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ در کارِ معاش
> آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تعارفِ کتب

۱۔ کتاب الصلوٰۃ مصنفہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ مترجمہ شیخ علی جواد صاحب شائع کردہ نور محمد، کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۵۴ کاغذ سفید کتابت اور طباعت دیدہ زیب۔ غیر مجلد۔ آرٹ پیپر کا ٹائٹل پیج۔ قیمت دو روپے پچیس پیسے۔

اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ حضرت امام المجاہدین قدوۃ المحدثین ابو عبداللہ محمد بن حنبلؒ نے کسی شہر میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ کوئی نماز پڑھی تھی۔ ان نمازیوں کی نماز چونکہ ناقص تھی باین معنی کہ انہوں نے ارکان نماز صحیح طریق پر ادا نہیں کئے تھے اس لئے بغداد واپس آکر حضرت امامؒ نے انہیں ایک رسالہ تحریر فرما کر بھیجا جس میں صحیح طریق پر نماز پڑھنے کے آداب مفصل طور سے بیان فرمائے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج جو پانچ فیصد مسلمان نماز پڑھتے ہیں ان میں بھی پچانوے فیصد غلط یا ناقص طریق پر پڑھتے ہیں۔ سب سے بڑی خرابی جو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر نمازی اپنی نماز بہت عجلت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ مثلاً رکوع کے بعد قیام نہیں کرتے۔ اسی طرح سجدوں کے درمیان توقف نہیں کرتے۔ اس عجلت پسندی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ۹۹ فیصد نمازی عربی سے نابلد ہیں اس لئے ان کی نماز شعوری فعل کے بجائے میکانکی حرکت بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جن کے لئے نماز فرض کی گئی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ "اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد" اس کے مقابلے میں ہماری یہ حالت ہے کہ ہم سیدھے کھڑے ہونے سے پہلے ہی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ وہ دعا ہے کہ اگر مسلمان اسے سمجھ کر پڑھے تو وہ شرک کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہم تو ان دعاؤں سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

شیخ علی جواد صاحب بلاشبہ ہماری طرف سے ہدیہ تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نہایت مفید رسالے کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ امام صاحبؒ کے سوانح حیات بھی درج کر دیئے ہیں جن کو پڑھ کر راقم الحروف جیسے سب مسلمان

کے دل میں بھی تھوڑی دیر کے لئے ایمان کی حلاوت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ امام صاحب نے اس مشہور حدیث افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جابر پر بلاشک عمل کر کے دکھا دیا۔ سچ کہا ہے کسی نے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

کیا اچھا ہوتا کہ ناشر صاحبان اس تحقیقی کتاب کو مجلد شائع کرتے کیونکہ یہ کتاب بلاشبہ اس قابل ہے کہ ہر نمازی مرد اور عورت اس کا بغور مطالعہ کرے تاکہ اپنی نماز کی اصلاح کر سکے اور اس پر یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زاویہ نگاہ سے اس نماز پر نماز کا اطلاق نہیں ہوتا جو غلط طریقے سے پڑھی جائے۔

---

(۷) **تلبیس ابلیس** مصنفہ علامہ ابن جوزی رح مترجمہ مولانا عبدالحق اعظم گڑھی۔
سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ سفید۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب۔ مجلد مع ڈسٹ کور
شائع کردہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی

اس کتاب کے مصنف چھٹی صدی ہجری کے مشاہیر علمائے اسلام میں سے ہیں۔ جن کے مختصر سوانح حیات کتاب کے شروع میں درج کر دیئے گئے ہیں وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم، خطیب، محدث اور فقیہ تھے۔

اس کتاب میں انہوں نے مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں، گمراہیوں اور غلط فہمیوں کی نشان دہی کی ہے۔ گمراہ فرقوں کے عقائد واضح کئے ہیں انہوں نے اپنے زمانے کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے۔ ہر طبقے اور ہر جماعت کے عقائد و افکار کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچا ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے، کہ ابلیس نے کن کن طریقوں سے اس امت کے مختلف طبقات و افراد کو دھوکا دیا ہے اور کن کن راہوں سے ان کے عقائد، اخلاق اور اعمال میں رخنہ ڈالا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں کسی طبقے، کسی جماعت یا کسی شخص کی رعایت نہیں کی ہے اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حکماء، علماء، محدثین، فقہاء، واعظین، شعرا، سلاطین، وزراء، امراء، حکام، زہاد، عباد اور صوفیہ کی کمزوریاں اور بے اعتدالیاں واضح کی ہیں۔ ان تمام طبقات میں انہوں نے صوفیوں خصوصاً گمراہ صوفیوں کی غلط روش پر سب سے زیادہ تنقید کی ہے۔ چنانچہ کتاب کے ۴۴۶ صفحات میں سے ۱۷۰ صفحات صرف صوفیوں کی کمزوریوں کی وضاحت کے لئے وقف کی ہیں۔ یہ کتاب ان کی وسعت نظر، وسعت معلومات، ژرف نگاہی، باریک بینی اور دقائق رسی کا بہترین نمونہ ہے۔

بلاشبہ اس دور پرفتن میں اس کتاب کی اشاعت بہت قابل قدر دینی خدمت ہے۔

---

(۳) **عیسائیت اور اسلام**۔ مؤلفہ الحاج محمد حفیظ اللہ صاحب لاری ایم اے۔
شائع کردہ انجمن تحفظ اسلام۔ جیلانی روڈ، نیم کی چاڑی۔ سکھر (سندھ) سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۴۰۔ سفید کاغذ۔ کتابت اور طباعت بہت اچھی۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

یہ کتاب ان چھ مقالات کا مجموعہ ہے جو محترمی لاری صاحب نے عیسائیت کی تردید میں لکھے ہیں انہوں نے اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کا موازنہ و مقابلہ کر کے اسلام کی عیسائیت پر برتری بھی ثابت کر دی ہے اور عیسائیت کے بنیادی عقائد کی تردید بھی کر دی ہے اس لئے یہ کتاب اس لائق ہے کہ عیسائیوں میں اس کی مفت اشاعت کا انتظام کیا جائے اور جن لوگوں کو عیسائیوں سے سابقہ پڑتا ہے انہیں بطور خود اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ جب ان سے تبادلہ خیالات کریں تو ان کے مذہب کی کمزوریاں ان پر واضح کر سکیں۔

---

(۴) **اسلام اور مرزائیت میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے؟**
(۵) **کادیانی مسیح حقیقت میں ایک دجال تھا۔**
مؤلفہ مولانا محمد احمد خاں صاحب رضوی　شائع کردہ انجمن تبلیغ الاسلام نشتر آباد گلی نمبر ۴ اول پور
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۴، ۸۔ نیوز پرنٹ: قیمت بیس پیسے و دس پیسے

پہلے ٹریکٹ میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام اور مرزائیت کا اختلاف فروعی نہیں ہے بلکہ اصولی ہے اور مرزائیت کے عقائد اسلام کے عقائد کی ضد ہیں۔ اس ضمن میں مجموعہ فتاویٰ احمدیہ صفحہ ۲۷۰ کی یہ عبارت بالکل واضح ہے "یہ بات بالکل غلط ہے کہ ہمارے اور غیر احمدیوں کے درمیان کوئی فروعی اختلاف ہے۔ کسی مامور من اللہ کا انکار کفر ہو جاتا ہے۔ ہمارے مخالف (مسلمان) حضرت مرزا صاحب کی ماموریت کے منکر ہیں۔ بتاؤ یہ اختلاف فروعی کیونکر ہوا؟"

مولانا نے اس کتابچے میں اصولی اختلاف کی دس مثالیں جمع کر کے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا ہے۔

دوسرے ٹریکٹ میں مولانا نے پہلے مرزا صاحب کا یہ قول درج کیا ہے کہ جھوٹ بولنا مرتد ہونے سے کم نہیں ہے" اس کے بعد ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "مولوی غلام دستگیر قصوری اور مولوی محمد اسمٰعیل علی گڑھی نے اپنی کتاب میں میری نسبت قطعی حکم لگایا کہ اگر وہ کاذب ہے تو ہم سے پہلے مرے گا اور ضرور ہم سے پہلے مرے گا۔ کیونکہ کاذب ہے۔ مگر جب وہ ان تالیفات کو دنیا میں شائع کر چکے۔ تو پھر بہت جلد آپ ہی مر گئے۔"

اس کے بعد مولانا نے تحقیق کی ہے کہ مولوی قصوری اور مولوی علی گڑھی مرحومین نے اپنی کسی کتاب میں یہ قطعی حکم نہیں لگایا اس لئے مرزا صاحب اپنے ہی مسلمات کی روشنی میں مرتد ہو گئے۔ یہ ٹریکٹ اس لائق ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے لیکن ایک بات کہے بغیر بھی نہیں مانتا۔ وہ یہ ہے کہ آج کل مسلمانوں کا معیار زندگی اور ذوق

جہاں اس قدر جنہ ہو چکا ہے کہ ان کا نیوز پرنٹ پر مطبوعہ، کچھ دعا کے سے سنے ہوئے، گنجان لکھے ہوئے، دھندلے چھپے ہوئے ٹریکٹ یا پمفلٹ کو پڑھنے کی طرف مائل ہونا بہت مشکل ہے اس لئے میرا دل یہ کہتا ہے کہ مسلمان نوجوان اس قسم کے ٹریکٹوں کو مفت پڑھنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ ہاں دیہات کے باشندے شاید خرید لیں مگر وہ علمی ذوق سے معرّیٰ ہیں۔

غرض دو گونہ عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ

---

(۶) **دعواتِ حق** یعنی افاداتِ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔ شائع کردہ حکمت الاسلامیہ نوشہرہ صدر ضلع پشاور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ، ۲۷۶ صفحات، کاغذ سفید، طباعت آفسیٹ، سرورق رنگین و مذہب۔ قیمت تین روپے، غیر مجلد۔

اس کتاب میں مولانا سمیع الحق صاحب نے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب کے خطبات جمعہ و دیگر اہم تقاریر کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ خطبے اور تقریریں مسلمانوں کے لئے بہت مفید ہیں کیونکہ ان کے مطالعہ سے ان کے اذہان شرک اور بدعت کی کثافت سے پاک ہو جائیں گے۔ حضرت شیخ الحدیث کے علمی اور دینی مقام کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ مجاہد اعظم شیخ الاسلام سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں افسوس کہ مطالب و معانی خطبات پر مفصل تبصرہ ممکن نہیں ہے اس لئے کتاب کے چند عنوانات کے اندراج پر اکتفا کیا جاتا ہے: اسرار و رموز تعوذ۔ فضائل درس قرآن۔ قوموں کی تباہی کے اسباب۔ نگاہ مومن میں جہاد اور شہادت کا مقام۔ گناہ کے مضر اثرات۔ عبدیت کا مظاہرہ۔ علم کی نعمت اور اس کے تقاضے۔ حقیقتِ ہجرت، حقیقتِ شہادت۔ تزکیۂ نفوس۔ تجارت کی اہمیت وغیرہ۔

---

(۷) **فیوضاتِ حسینی** المعروف بہ تحفۂ ابراہیمیہ۔ تالیف (بزبان فارسی) رئیس المفسرین جامع شریعت و طریقت، ماحی شرک و بدعت مولانا حسین علی صاحب نقشبندی، ساکن واں بھچراں ضلع میانوالی۔ ترجمہ و مقدمہ مبسوط از مولانا عبدالحمید صاحب سواتی مہتمم مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ۔ ناشر: ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ مذکورہ گوجرانوالہ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ دو سو صفحات، کاغذ سفید، کتابت و طباعت دلکش۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ۔

فاضل مترجم نے پہلے سو صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جس میں مصنف مرحوم کے سوانح حیات علمی و عملی کمالات اور تصنیفات و خدمات کا بیان کیا ہے۔ بعد ازاں مرحوم کے تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ خود مترجم نے اس کتاب کے ترجمے اور اشاعت

کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ طالبان حق کو حق تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ یہ رسالہ نہایت مختصر اور جامع ہے۔ اس کے مصنف (مولانا حسین علی رح) ملک کے نامور محقق، قامع شرک و بدعت، حامی توحید، اور اہل اللہ میں سے تھے۔ قطب الارشاد حضرت گنگوہی رح کے شاگرد اور خواجہ محمد عثمان دامانی رح کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے ساٹھ برس تک مغربی پنجاب میں توحید اور سنت کا علم بلند کئے رکھا۔ مولانا غلام اللہ خاں صاحب انہی کے شاگرد ہیں۔ مولانا سواتی نے نہایت سلیس اردو میں متن کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب تو طالبان راہ حق کے لئے مفید بلکہ ضروری ہے ہی، اس پر جو مقدمہ مولانا نے لکھا ہے وہ بھی بجائے خود نہایت مفید، معلومات افزا اور عالمانہ ہے۔ چونکہ مصنف جامع شریعت و طریقت تھے اس لئے انہوں نے اسلامی تصوف کی تعلیمات کو قرآن و حدیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے اور جگہ جگہ امام غزالی رح، امام قشیری رح، شاہ ولی اللہ رح اور بزرگان سلسلہ نقشبندیہ سے استشہاد کیا ہے۔ اس کا مطالعہ عوام اور خواص دونوں کے لئے مفید ہوگا۔ (انشاء اللہ)

---

(۸) **مودودی جماعت سے مخالفت کیوں؟** مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن سلہٹی، نائب ناظم جمعیت علماء اہل سنت مشرقی پاکستان۔ شائع کردہ دارالاشاعت جمعیۃ علماء اہل سنت ۵۹/۱ اے پیاری داس روڈ، ڈھاکہ ۱۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ۴۴ صفحات، کاغذ سفید، کتابت اور طباعت عمدہ، غیر مجلد قیمت سوا روپیہ۔

اس کتاب میں فاضل مرتب نے سب سے پہلے مودودی صاحب کی تصانیف سے حوالے پیش کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے عقائد اہل سنت کے عقائد سے مختلف ہیں۔ اس کے بعد کوثر نیازی صاحب کا وہ بیان من و عن درج کر دیا ہے جس میں انہوں نے جماعت اسلامی کی مذہبی اور سیاسی قلابازیوں کی تفصیل سپرد قلم کی ہے۔ اس کے بعد مودودی جماعت سے متعلق ہند و پاکستان کے علماء مثلاً مولانا تھانوی رح، مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم، مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم دیوبندی، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رح، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، مولانا سعید احمد صاحب کاظمی، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی آراء درج کی ہیں۔ اس کتاب میں علماء ہند و پاکستان نے متفقہ طور پر مودودی صاحب کی جماعت کو مسلمانوں کے لئے مضرت رساں قرار دیا ہے۔ مثلاً مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ "افسوس ہے کہ میں ضعف وقت سے مجبور ہوں ورنہ اہل اسلام کے سامنے اس زہر کو پیش کرتا جو اس جماعت کی جانب سے شہد میں ملا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس لئے بالاختصار اس قدر عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ جماعت مسلمانوں کے دین کے لئے مرزائی جماعت سے بھی زیادہ ضرر رساں ہے۔" جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

---

(۹) **نماز** مولفہ مولانا مسعود احمد صاحب۔ شائع کردہ جماعت المسلمین ۲/۵ دہلی سوداگران روڈ آف شہید ملت روڈ کراچی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۷۹ صفحات۔ کاغذ سفید۔ کتابت اور طباعت عمدہ۔ غیر مجلد قیمت ڈھائی روپے۔

مؤلف نے اس کتاب میں نماز سے متعلق تمام مسائل بھی بیان کر دیئے ہیں اور صحیح طور سے نماز ادا کرنے کے طریقے بھی واضح کر دیئے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو مسئلہ بیان کیا ہے اس کے ثبوت میں حدیث اور فقہ کی کتابوں سے اصل عربی میں حوالے بھی نقل کر دیئے ہیں اور ان کا اردو ترجمہ بھی درج کر دیا ہے۔ ہماری رائے میں مؤلف نے یہ کتاب مرتب کر کے وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے کیونکہ آجکل اکثر و بیشتر نمازی آداب ادائے صلوٰۃ سے ناواقف ہیں حالانکہ حدیث نبوی میں نماز کو صحیح طریق پر ادا کرنے کی بڑی تاکید ہے۔

---

(۱۰) **قصیدہ بانت سعاد**۔ ترجمہ پروفیسر علی محسن صدیقی۔ ناشر مکتبہ اسحاقیہ۔ جونا مارکیٹ، پھول چوک، کراچی ۲۔ کاغذ سفید سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۰۷ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ، غیر مجلد۔ قیمت: سوا دو روپے۔

کعب ابن زہیر کا قصیدہ موسوم بانت سعاد۔ غایت شہرت کی بنا پر کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مترجم نے اس قصیدے کا متن نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ حل لغات تسلی بخش طور پر کیا ہے۔ ترجمے میں سلاست اور روانی کو مدنظر رکھا ہے۔ قصیدے سے پہلے ایک مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں کعب ابن زہیر کے مختصر سوانح حیات، ان کی شاعری کی خصوصیات اور اس قصیدے کی اہمیت درج کی ہے۔ ۸۸ صفحے کا یہ مقدمہ بلاشبہ بڑے کام کی چیز ہے۔ مترجم اور ناشر دونوں نے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔

---

(۱۱) **تجدید سبائیت** حصہ اول بجواب "خلافت و ملوکیت" مصنفہ حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ شائع کردہ جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان چوک رنگ محل لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۵۹ صفحات غیر مجلد قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

مودودی صاحب کی رسوائے زمانہ تالیف "خلافت و ملوکیت" کی تردید کی سعادت جن علما کو حاصل ہوئی ہے ان میں حضرت شیخ الحدیث کا اسم گرامی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ مودودی صاحب کی کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں حضرت موصوف نے بالکل درست فرمایا ہے کہ "مودودی صاحب کے متعلق اہل بصیرت تو بہت دنوں سے سمجھ گئے تھے کہ سبائیت کے جراثیم کی خاصی تعداد موصوف کے دل و دماغ پر قابض و متصرف ہے اور انہیں عظمت صحابہ رض سے بالکل خالی کر چکی ہے لیکن موصوف کی تازہ تالیف "خلافت و ملوکیت" نے تو نقاب تقیہ کو بالکل ہی پارہ پارہ کر کے موصوف کی سبائیت کو الم نشرح کر دیا ہے بلکہ کتاب میں جس خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ سبائیت کے تلخ ستیز کو شیریں بنا کر ناواقفوں کے

(بقیہ صفحہ ۸۵ پر)

افکار و آراء

"یہ غلطی کب تک"

ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی، اشاعت ۷ مارچ ۱۹۶۹ء کا اداریہ

پچھلے ہفتہ پاکستانی اخبارات جمہوری مجلس عمل کے لیڈروں کی تصویروں کے ساتھ بھرے ہوئے تھے۔ صدر ایوب نے اپنے مخالف لیڈروں سے غیر مشروط گفتگو کی جو پیشکش کی تھی اس نے راولپنڈی کو چند روز کے لئے تمام پاکستانی لیڈروں کا مرکز بنا دیا۔ کہیں مولانا مودودی مسٹر ایم انور سے مصروف گفتگو ہیں کہیں میاں ممتاز دولتانہ اور خان ولی خان باہم سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کہیں مسٹر نورالامین اور خواجہ خیرالدین رازدارانہ گفتگو میں مشغول دکھائی دے رہے ہیں۔ کہیں چودھری محمد علی اور نوابزادہ نصراللہ خان تبادلہ خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آخری وقت آ گیا ہے جبکہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جانے والا ہو۔

لیڈروں کی یہ سرگرمیاں ان طویل ہنگاموں کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں جن کی مثال پاکستان کی تاریخ میں قبل از تقسیم کے ڈائرکٹ ایکشن کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ پچھلے چند مہینوں سے پاکستان اپنی زندگی کے انتہائی ہنگامہ خیز دور سے گزر رہا ہے۔

پاکستان کے لوگوں میں یہ زبردست حرکت کیوں پیدا ہوئی۔ صرف ایک مقصد کے لئے۔ وہ یہ کہ صدر ایوب کو صدارت کی گدی سے ہٹا دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں صدر ایوب کو ان کے عہدہ سے ہٹانا ضروری ہو۔ مگر پاکستانی سیاست کے اس بھونچال نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان آج بھی اسی لاحاصل جذباتیت میں مبتلا ہیں۔ جہاں وہ سو برس پہلے تھے۔

پاکستان کو بے شمار نہایت اہم مسائل در پیش ہیں۔ مثال کے طور پر تمام مسلم ممالک بشمول پاکستان صنعت اور سائنس میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مغربی ممالک کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ ان کی سیاسی آزادی نے انہیں صرف اقتصادی غلامی کے ایک نئے دور سے دوچار کیا ہے۔ اگر پاکستان اس معاملہ میں کم از کم جاپان کی حد تک بھی ترقی کر جائے تو وہ مسلم ممالک کو اقتصادی غلامی سے نجات دلانے کا نقیب بن سکتا ہے۔ اسی طرح آج تمام دنیا ایک پر امن اور عادلانہ سماج کیلئے ترس رہی ہے۔ اگر

پاکستان اس معاملہ میں اسلام کا نمونہ بننے کی کوشش کرتا تو وہ موجودہ دنیا میں ایک روشن مینار بن کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسی طرح دنیا کے بہت سے علاقوں میں مسلمان آبادیاں صرف اس لئے پس رہی ہیں کہ کوئی طاقتور مسلم ملک ان کی پشت پناہی کرنے والا نہیں۔ آج اگر پاکستان اتنا ہی طاقتور ہو جائے جتنا کہ مثال کے طور پر امریکہ ہے تو اس کی صرف ایک گرجدار آواز کتنے علاقوں میں مسلمانوں کی حفاظت اور سالمیت کے لئے کافی ہوگی۔

اسی طرح کے کتنے مسائل ہیں جو پاکستان کی قسمت بن کر اس کے اوپر لٹک رہے ہیں مگر ان میں سے کسی مسئلہ پر پاکستانی عوام یا پاکستانی لیڈروں اور پیشواؤں میں کوئی حرکت پیدا نہ ہو سکی البتہ ایوب کو صدارت سے ہٹانے کے لئے اتنا زبردست طوفان برپا ہے کہ گویا ایوب ہٹے نہیں کہ پاکستان جنت نظیر بن گیا۔

افسوس کہ ہم طویل ترین مدت سے ایک ہی غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں ساری تبدیلیوں اور کامیابیوں کا دروازہ ہے اور اگرچہ تجربات نے اس طریقہ کی غلطی آخری حد تک واضح کر دی ہے مگر اس معاملہ میں ہمارا ذہن کسی طرح بدلنے کا نام نہیں لیتا۔

انگریز کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہم نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ہمارے تمام اصاغر و اکابر سمجھ بیٹھے تھے کہ انگریز کے ہٹتے ہی اسلام کی روایتی عظمت و شوکت کا دور دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ انگریز نے سیاسی گدی چھوڑ دی اور اس واقعہ پر تقریباً چوتھائی صدی گزر گئی مگر ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہ ہوا بلکہ شدید تر ہو گیا۔

اس سنگین تجربہ کا کم سے کم فائدہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم سیاسی تبدیلیوں کا بے حقیقت ہونا سمجھ جاتے۔ اور یہ جان لیتے کہ زندگی اور تقدیر بنانے میں کچھ دوسرے عوامل زیادہ اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ سب کچھ کھونے کے باوجود ہمیں یہ فائدہ بھی حاصل نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈروں کی موجودہ سرگرمیاں اور گفت و شنید کی دوڑ دھوپ طفلانہ ہنگاموں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ صدر ایوب کو ان کے سیاسی عہدے سے ہٹا دینا کسی بھی درجہ میں پاکستان کے کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

پاکستانی لیڈروں کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ پاکستان میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ قوم وجود میں لاتے۔ اس کو ایک مضبوط ملک بناتے مگر اس مشکل کام کی تاب وہاں کے کسی لیڈر میں نہیں تھی اس لئے انہوں نے اس آسان راستہ کو اپنا لیا کہ دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامے برپا کر کے اپنی اہمیت کا مظاہرہ کریں۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ آج کے لحاظ سے خواہ پاکستانی عوام کو ان کے نعرے کتنے ہی پُر امید نظر آتے ہوں مگر مستقبل کے اعتبار سے ان نعروں میں پاکستان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ مستقبل کی تعمیر کے لئے قوم و ملک کو بدلنے کی ضرورت ہے نہ کہ سیاسی عہدوں کو بدلنے کی۔

علومِ قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول ——— مشتمل بر

مقدمہ و تفسیر آیۃ بسم اللہ، سورۃ فاتحہ، سورۃ بقرہ و سورۃ آلِ عمران

"اہلِ علم اور طلبہ ان کے مطالعے سے ذہن کے قابل اور بیٹوں کے لئے ایک قابل قدر زیادہ... عبارت متین و محکم، شستہ و سلیس، شاندار اور باوقار، موثر اور ادیبانہ... مصنف زندگی بھر اور کچھ نہ کرتے صرف یہی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑ جاتے تو بھی خدمتِ قرآن کا حق ادا کر جاتے"
(مولانا عبدالماجد دریابادی، مدیر 'صدق جدید')

سائز [illegible]، صفحات [illegible]

عمدہ دبیز سفید کاغذ

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

جرمن بفتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ [illegible] روپے

(محصول ڈاک: ڈھائی روپے)

(تیس روپے پچاس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

(نمونہ کے صفحات مفت طلب فرمائیں)

★

شائع کردہ

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوٹر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 (فون نمبر 69522)